دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۶ ماہ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۱۰ء عدد ۵

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

اگلے چند دنوں میں اس عالم فانی سے علامہ شبلیؒ کی رحلت اور دارالمصنّفین کی تاسیس پر ۹۶ سال پورے ہو جائیں گے۔ دارالمصنفین علامہ شبلیؒ کا ایک خواب تھا جس کی تعبیر ان کے تلامذہ نے اپنے خون جگر سے لکھی۔ عالی مرتبت استاد کی بارگاہ میں اس سے بہتر نذرانۂ عقیدت نہیں پیش کیا جاسکتا تھا۔ اخلاص وقناعت کی دولت سے مالا مال ان ایثار پیشہ بوریہ نشینوں نے جن حالات میں اور جس طرح یہاں علم ودانش کی شمع روشن رکھی اور جس وفاداری اور استواری سے اس ادارہ کے عظیم مقاصد کی پاسداری کی وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس ادارہ کے نام اور کام کو جو اعتبار اور استناد حاصل ہوا اس میں اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔ مسلمانوں کو اپنے ماضی سے جوڑنے، ان کے اندر اپنی تاریخ سے وابستگی کا شعور اور اس پر فخر کا احساس پیدا کرنے اور تاریخ اسلام کے روشن چہرے سے اعتراضات اور شکوک وشبہات کی گرد صاف کرنے کے سلسلہ میں سیرت رسول ﷺ کے اس خدمت گزار ادارہ نے، جس کی اساس ختم الرسل ﷺ کی سیرت نگاری پر رکھی گئی ہے، جو کردار ادا کیا ہے عہد جدید میں برصغیر کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ نئی نسلوں کی ذہنی تربیت اور اس کے لیے فکری غذا فراہم کرنے کے میدان میں دارالمصنّفین کا حصہ غیر معمولی رہا۔ اتنی عظیم الشان خدمات اور ایسی درخشاں تاریخ کے باوجود اسلاف کا یہ گراں مایہ ورثہ کچھ مدت سے جن حالات سے دوچار رہا ہے دارالمصنفین کے بہی خواہ اس سے واقف ہیں۔

گذشتہ دوڈھائی سال سے اس کی تعمیر نو کے لیے جو ٹوٹی پھوٹی کوششیں کی جارہی ہیں اور ان کے نتیجہ میں جس حد تک یہاں کے حالات میں بہتری کی صورت پیدا ہوئی ہے اس سے بھی آگاہ ہیں۔ حالات میں بہت کچھ بہتری کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ اب بھی منزل مراد تک پہنچنے کی راہ میں طویل فاصلے اور حوصلہ شکن رکاوٹیں حائل ہیں۔ دعا ہے کہ چار سال بعد جب دارالمصنفین اپنی عمر کے سو سال پورے اور نئی صدی میں قدم رکھے تو اس وقت تک نہ صرف یہ کہ اس کی تمام بنیادی ضرورتیں پوری ہو چکی ہوں بلکہ یہ ایک ایسے ادارہ کا قالب اختیار کر چکا ہو جو بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں اور امت کو درپیش نئے چیلنجوں کا پورا ادراک رکھتا ہو اور اپنے عظیم موسس کے مشن اور وژن

کے مطابق ان سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

ابھی گزرے ستمبر میں دستوری اصلاحات کے ریفرنڈم کے انعقاد اور ترکوں کی واضح اکثریت کے ذریعہ اس کی تائید کے بعد یہ توقع ہو چلی تھی کہ اب ملک میں جمہوری اقدار کو فروغ حاصل ہوگا اور ترک معاشرہ ان بنیادی شہری حقوق اور آزادیوں سے بہرہ ور ہو سکے گا جس سے فوج اور دوسرے سیکولر بنیاد پرست اداروں نے اب تک اسے محروم کر رکھا تھا۔امید یہ تھی کہ سیکولر طاقتیں اور وہ ادارے جو اپنے آپ کو سیکولرازم کا محافظ اور پاسبان تصور کرتے ہیں ملک کی بدلتی ہوئی صورت حال کا ادراک کرلیں گے اور اپنے طرز عمل کو بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں گے۔اس طرح ملک میں مذہبی اور سیکولر عناصر کے درمیان گذشتہ تقریباً ایک صدی سے جاری کشمکش اور محاذ آرائی کا خاتمہ ہو جائے گا اور باہمی مفاہمت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔لیکن ایسا نہیں ہوسکا اور سیکولر عناصر نے جو طرز عمل اختیار کیا اسے افسوس ناک ہی قرار دیا جاسکتا ہے اس کی ایک مثال ۲۹ر اکتوبر کو سامنے آئی جب فوج کے سربراہوں نے اور ملک کی سب سے اہم اپوزیشن پارٹی ریپبلکن پیوپلز پارٹی (CHP) کے لیڈروں نے صدارتی محل میں روایتی یوم جمہوریہ تقریبات کا محض اس وجہ سے بائی کاٹ کیا کہ ملک کی خاتون اول، جو حجاب استعمال کرتی ہیں، صدر عبداللہ گل کے ساتھ مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔مزید برآں فوج نے متوازی تقریبات کا اہتمام کیا۔واضح طور پر فوج نے مفاہمت کے بجائے محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا ہے۔دستور کے مطابق صدر مسلح افواج کا کمانڈران چیف بھی ہوتا ہے چنانچہ اس بائیکاٹ کو کمانڈران چیف کے خلاف بغاوت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔اس سلسلہ میں فوج اور اپوزیشن کے گٹھ جوڑ نے صورت حال کو مزید پیچیدہ کر دیا ہے۔اس سے نہ تو فوج کا وقار بڑھا ہے اور نہ اپوزیشن کا۔ عام طور پر اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور مبصرین نے اسے ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ قرار دیا ہے۔واضح طور پر فوج اپنے اختیارات سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے لیکن اسے یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ حالات اب بدل چکے ہیں اور اب زیادہ دنوں تک ترک عوام کی بڑی اکثریت کی آرزوؤں اور امنگوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔فوج اور اپوزیشن ایک ایسے راستے پر گامزن ہیں جس کا انجام ناکامی ہے۔ یہ نوشتہ دیوار ہے اور جتنی جلد اس کا

ادراک کرلیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

افراد کی طرح قوموں کی آزمائش بھی بحران کے وقت ہوتی ہے۔ گذشتہ دنوں جنوبی امریکہ کا ایک چھوٹا سا ملک چلی ایک شدید بحران کی زد میں رہا اور اس کی وجہ سے عالمی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ وہاں کی حکومت اور عوام نے جس طرح اس بحران کا سامنا کیا وہ کسی بھی ملک یا قوم کے لیے باعث فخر ہے۔ شمالی چلی کی ایک کان میں ۵/اگست کو ایک حادثہ کے نتیجہ میں سطح زمین سے ۲۳۰۰ فیٹ نیچے ۳۳ کان کن اس طرح پھنس گئے کہ بیرونی دنیا سے ان کا رابطہ منقطع اور ان کی واپسی کے راستے یکسر مسدود ہوگئے۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں حکومتوں کی نظر میں انسانی جان کی جو قدر و قیمت ہے اور ایسے مواقع پر ان کی طرف سے بالعموم جس قسم کا رویہ سامنے آتا ہے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ چلی کی حکومت نے اس صورت حال سے عہدہ برا ہونے کے لیے جو طرز عمل اختیار کیا وہ ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۷ دنوں تک زیر زمین محصور ان کان کنوں کا بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہوسکا۔ اس طویل مدت میں نہ تو کان کنوں نے ہمت ہاری اور نہ حکومت نے ان کے بچانے کی کوششوں میں کمی آنے دی۔ کان کنوں نے جس استقلال، پامردی اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا، وہ قابل ستائش ہے۔ دوسری طرف صدر مملکت کی ذاتی نگرانی میں حکومت نے اس مہم میں اپنے تمام وسائل جھونک دیے۔ چند انسانی جانوں کو بچانے کے لیے اتنی طویل، اتنی مشکل اور اتنی پرعزم مہم کی کوئی مثال نہیں ہے۔ بالآخر انسانی عزم نے یہ ناقابل یقین مہم سر کرلی اور ۶۹ دن زیر زمین محبوس رہنے کے بعد تمام کان کنوں کو بحفاظت باہر نکال لیا گیا۔ تقریباً ۲۴ گھنٹہ جاری رہنے والی اس مہم کے دوران چلی کے صدر اپنی بیگم کے ساتھ وہاں موجود رہے اور باہر آنے والے ہر کارکن کا گلے لگا کر استقبال کیا۔ اس موقع پر صدر نے یہ بھی کہا کہ اگر اس کام میں ملک کا پورا خزانہ خالی ہوجاتا تو بھی وہ اس سے دریغ نہ کرتے۔ پورے ملک نے جس والہانہ انداز میں موت کے منہ سے زندگی کی طرف ان کان کنوں کی واپسی کا استقبال کیا وہ ناقابل بیان ہے۔ کتنی حکومتیں انسانی جان کے اس احترام، شرف اور تقدس کو ملحوظ رکھتی ہیں اور اس سلسلہ میں اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داری کو محسوس کرتی ہیں۔

مقالات

علامہ واقدی۔فن سیر کے امام

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی (۱۳۰ھ-۲۰۷ھ) حافظ حدیث، مورخ اور سیرت نگار کی حیثیت سے خاص شہرت کے مالک ہیں، ان کی غیر معمولی یادداشت اور بے پناہ وسعت معلومات کا بھی عام طور پر اعتراف کیا گیا ہے، یہ درست ہے کہ محدثین کی بارگاہ میں ان کا پایہ بلند نہیں لیکن طبقات وتراجم اور سیرت ومغازی کے باب میں ان کا فضل وکمال مسلم ہے، حافظ ابوبکر الخطیب (ف ۴۶۳ھ) تاریخ بغداد میں اپنی سند سے نقل کرتے ہیں:

سئل مالك بن انس عن المرأة التى سمت النبى ﷺ بخيبر ما فعل بها؟ فقال ليس عندى بها علم وسأل اهل العلم، فقال فلقى الواقدى فقال: يا ابا عبد الله، ما فعل النبى ﷺ بالمرأة التى سمته بخيبر؟ فقال الذى عندنا انه قتلها، فقال مالك: قد سالت اهل العلم فاخبرونى انه قتلها۔(۱)

امام مالک بن انس سے دریافت کیا گیا کہ نبیؐ نے اس عورت کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا جس نے خیبر میں آپ کو زہر دینے کی کوشش کی تھی؟ انہوں نے فرمایا مجھے اس کا علم نہیں، ہاں میں اہل علم سے اس کے بارے میں دریافت کروں گا، اس کے بعد امام مالک کی ملاقات واقدی سے ہوئی، انہوں نے پوچھا ابوعبداللہ! نبیؐ نے اس عورت کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا جس نے خیبر میں آپ کو زہر دیا تھا؟ واقدی نے جواب دیا ہماری معلومات

اردو ڈپارٹمنٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کے مطابق آپؐ نے اسے قتل کرادیا۔

خطیب نے اسی طرح کی ایک اور روایت بھی نقل کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

سئل مالك عن قتل الساحرة ، فقال : انظروا هل عند الواقدى من هذا شئ ؟ فذاكروه ذلك ، فذكر شيئا من الضحاك بن عثمان ، فذكروا ان مالكا قنع به ۔ (۲)

امام مالک سے جادوگر عورت کے قتل کے بارے میں دریافت کیا گیا، انہوں نے فرمایا پتہ لگاؤ کیا واقدی کے پاس اس سے متعلق کوئی روایت ہے؟ لوگوں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے ضحاک بن عثمان کی سند سے کوئی روایت بیان کی، لوگوں کا کہنا ہے کہ امام مالک کو اس سے تسلی ہوگئی۔

ان بیانات سے معلوم ہوا کہ امام مالک (ف ۱۷۹ھ) کی نگاہ میں واقدی کی بڑی قدر و منزلت تھی، وہ انہیں اہل علم کے زمرے میں شمار کرتے تھے اور بطور خاص سیرت و مغازی کے باب میں ان پر اعتماد کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبل (ف ۲۴۱ھ) جو واقدی کے سب سے اہم جارح ہیں اور جنہوں نے اپنی رایوں سے یحییٰ بن معین (ف ۲۳۳ھ) اور علی بن المدینی (ف ۲۴۱ھ) جیسے ائمہ فن کو بھی متاثر کیا ہے، ان کا یہ خیال تھا کہ واقدی کی تصانیف برابر مطالعے میں رکھتے تھے، چنانچہ ابراہیم بن جابر امام احمد کے بیٹے عبداللہ کا بیان نقل کرتے ہیں:

حدثنی عبد اللّٰه بن احمد بن حنبل قال : كتب ابى عن ابى يوسف و محمد ثلاثة قماطر ، فقلت له كان ينظر فيها ؟ قال : ربما كان نظر فيها ، وكان اكثر نظره فى كتب الواقدى ۔(۳)

ابراہیم بن جابر کہتے ہیں کہ مجھ سے عبداللہ بن احمد بن حنبل نے بیان کیا کہ میرے والد نے ابو یوسف اور محمد کی روایات کے تین بستے لکھ رکھے تھے، میں نے پوچھا کیا وہ ان کا مطالعہ بھی کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کبھی کبھار دیکھ لیا کرتے تھے، وہ زیادہ تر واقدی کی کتابیں مطالعے میں رکھتے تھے۔

اسی طرح کی ایک دوسری روایت ابراہیم الحربی سے بھی منقول ہے:

قال ابراهيم الحربى : لم يزل احمد بنحنبل يوجه فى كل جمعة بحنبل بن اسحاق الى محمد بن سعد كاتب الواقدى ، فياخذ له جزئين جزئين من حديث الواقدى ، فينظر فيها ثم يردها و ياخذ غيرها ـ(۴)

ابراہیم الحربی کہتے ہیں: امام احمد بن حنبل کا معمول تھا کہ وہ ہر جمعہ کے دن حنبل بن اسحاق کو واقدی کے کاتب محمد بن سعد کے ہاں بھیجا کرتے تھے تاکہ وہ واقدی کی احادیث کے دو دو جزء ان کے لیے لیتے آئیں، وہ ان کا مطالعہ کرتے، پھر اسے واپس کرکے دوسرے دو جزء منگا لیتے تھے۔

ان بیانات سے ثابت ہوا کہ امام احمد واقدی کی تکذیب وتضعیف کے باوجود نہ تو انہیں یکسر نظر انداز کرتے تھے اور نہ ہی ناقابل ذکر تصور کرتے تھے بلکہ واقدی کی کتابوں سے استفادہ ان کے معمولات میں شامل تھا۔

امام شافعی (ف ۲۰۴ھ) سے بھی واقدی کی تضعیف کے اقوال مروی ہیں لیکن علامہ ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) کی تصریح کے مطابق وہ بھی امام احمد کی طرح واقدی کی تصانیف سے استفادہ کرتے رہتے تھے، چنانچہ اپنی تصنیف الصارم المسلول علی شاتم الرسول میں تحریر فرماتے ہیں:

مع ما فى الواقدى من الضعف ...... لا يختلف اثنان ان الواقدى اعلم الناس بتفاصيل امور المغازى و اخبرهم باحوالها ، وقد كان الشافعى واحمد و غيرهما يستفيد ون علم ذلك من كتبه ـ(۵)

واقدی کا ضعف اپنی جگہ پر......اس کے باوجود کوئی دو آدمی بھی اس باب میں مختلف الخیال نہیں ہو سکتے کہ واقدی سیر و مغازی سے متعلق امور کی تفصیلات کے سب سے زیادہ واقف کار اور اس کے احوال سے سب سے زیادہ باخبر ہیں، چنانچہ امام شافعی، امام احمد اور دیگر حضرات اس باب میں ان کی کتابوں سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔

اس اقتباس سے مسئلہ زیر بحث میں خود علامہ ابن تیمیہ کے موقف کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ وہ بھی واقدی کو ضعیف سمجھنے کے باوجود سیر ومغازی کا سب سے بڑا عالم تصور کرتے ہیں اور ان سے استفادے کو اہل علم کی روایت قرار دیتے ہیں۔

واقدی سے استفادے کے سلسلے میں یہی موقف حافظ ابن حجر عسقلانی (ف ۸۵۲ھ) کا بھی ہے، انہوں نے اپنی مختلف تصانیف میں واقدی کے لیے بارہا "متروک"، "ضعیف"، "لیس بحجة" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اس کے باوجود "التلخیص الخبیر" میں لکھتے ہیں:

والواقدی اذا لم یخالف الاخبار الصحیحة ولا غیرہ من اھل المغازی مقبول فی المغازی عند اصحابنا۔(٦)	واقدی ہم محدثین کے یہاں مغازی کے سلسلے میں مقبول ہیں، بشرطیکہ روایات صحیحہ اور دیگر اہل مغازی کی مخالفت نہ کر رہے ہوں۔

ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہوا کہ سیرت ومغازی میں واقدی کا تبحر وکمال شکوک وشبہات سے بالاتر ہے، یہاں تک کہ جن لوگوں نے حدیث میں ان کی تضعیف کی ہے یا تضعیف کو راجح قرار دیا ہے، وہ بھی طبقات وتراجم اور مہمات سیرت میں ان سے استفادے کے قائل ہیں۔

اس مسلک کی حکایت وترجمانی ہمارے بعض ہندوستانی علمائے محققین نے بھی کی ہے، چنانچہ علامہ شوق نیموی (ف ۱۳۲۲ھ) آثار السنن میں تحریر فرماتے ہیں:

والواقدی وان کان مجروحا عند المحدثین فی الحدیث لکنه راس فی المغازی والسیر و الاخبار والحوادث الکائنة فی وقت النبی ﷺ وبعد وفاته۔(٧)	واقدی اگرچہ محدثین کے نزدیک حدیث میں مجروح قرار دیے گئے ہیں لیکن مغازی وسیرت اور عہد نبوی نیز آپ کی وفات کے بعد کے حالات و واقعات کے سلسلے میں امام ہیں۔

اسی طرح مولانا محمد یوسف کاندھلوی (ف ۱۳۸۴ھ) امانی الاحبار فی شرح معانی الآثار میں لکھتے ہیں:

والواقدی وان اختلف المحدثون	واقدی کی تضعیف وتوثیق اگرچہ محدثین کے

فی جرحه وتعدیله لکنه راس فی المغازی والسیر والاخبار والحوادث الکائنة فی وقت النبی ﷺ وبعد وفاته۔(۸)	درمیان مختلف فیہ ہے لیکن وہ مغازی وسیرت اور عہد نبوی نیز آپ کی وفات کے بعد کے حالات وواقعات کے سلسلے میں امام ہیں۔

واقدی کے سلسلے میں یہ نظری گفتگو تھی، عملی صورت حال یہ ہے کہ سیرت نبوی کے موضوع پر ابن اسحاق (ف ۱۵۰ھ) کی کتاب المبتدا والمبعث المغازی کے بعد دوسرے قدیم ترین ماخذ کی حیثیت واقدی ہی کی ہے، چنانچہ ابن سعد (ف ۲۳۰ھ) کی الطبقات الکبریٰ دراصل واقدی کی کتب سیرت اور کتاب الطبقات ہی کی توسیع ہے، اس کے علاوہ ابن جریر الطبری (ف ۳۱۰ھ) کی تاریخ الرسل والملوک، ابوعبداللہ الحاکم (ف ۴۰۵ھ) کی المستدرک اور حافظ ابن کثیر الدمشقی (ف ۷۷۴ھ) کی البدایہ والنہایہ میں بھی واقدی ہی کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، اسی طرح زمانہ مابعد کے تمام اہم اور قابل ذکر سیرت نگاروں نے اپنی اپنی تصانیف سیرت میں واقدی کی خوشہ چینی کی ہے، چنانچہ ابوعبدالرحمٰن السہیلی (ف ۵۸۱ھ) کی الروض الانف، ابن سید الناس (ف ۷۳۴ھ) کی عیون الاثر، علامہ ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کی زاد المعاد اور شیخ محمد بن عبدالباقی الزرقانی المالکی (ف ۱۱۲۲ھ) کی شرح مواہب اللدنیہ کے صفحات پر واقدی کی روایات سیرت سے استفادے کی شہادتیں جابجا ثبت ہیں۔

سیرت نگاروں کے علاوہ حافظ ابن حجر عسقلانی (ف ۸۵۲ھ) اور علامہ بدرالدین عینی (ف ۸۵۴ھ) جیسے بلند پایہ شارحین بخاری نے صحیح بخاری کی احادیث وروایات پر گفتگو کرتے ہوئے واقدی کے بہ کثرت حوالے دیے ہیں، اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ ابوعبداللہ الحاکم نے کھلے لفظوں میں یہ اعتراف کیا ہے کہ جب انہوں نے صحابہ کرام سے متعلق صحیحین کی روایات پر اضافے کا ارادہ کیا اور بالخصوص ان کے انساب ووفیات کی تفصیلات قلم بند کرنا چاہا تو واقدی سے استفادہ کیے بغیر انہیں کوئی چارۂ کار نظر نہیں آیا، چنانچہ المستدرک کی تیسری جلد میں کتاب معرفۃ الصحابۃ رضی اللہ عنہم کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں:

اما الشیخان فانهما لم یزیدا علی	جہاں تک امام بخاری اور امام مسلم کا تعلق ہے

المناقب ، وقد بدأنا فی اول ذکر الصحابی بمعرفة نسبه ووفاته ثم بما یصح علی شرطهما من مناقبه مما لم یخرجاه ، فلم استغن عن ذکر محمد بن عمر الواقدی ـ(۹)

تو ان دونوں نے مناقب سے متعلق زیادہ روایات نہیں لی ہیں، ہم نے ہر صحابی کے ذکر میں پہلے اس کے نسب اور اس کی وفات کا بیان کیا ہے، پھر مناقب سے متعلق وہ روایات ذکر کی ہیں جو شیخین کی شرط پر ہیں اور ان دونوں کے یہاں موجود نہیں ہیں، پس میں محمد بن عمر واقدی کے ذکر سے بے نیاز نہیں رہ سکا۔

اس سلسلے کی سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی بھی واقدی سے استفادہ کیے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ علامہ شبلی کے تعلق سے مولانا محمد ادریس کاندھلوی ''سیرۃ المصطفیٰ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''دنیا میں سیرت اور مغازی اور رجال کی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جو واقدی کی روایات سے خالی ہو، فتح الباری اور زرقانی شرح مواہب واقدی کی روایات سے بھری پڑی ہیں اور خود علامہ شبلی نے بھی بکثرت واقدی سے استفادہ اور استفاضہ کیا ہے، سیرۃ النبی کے متعدد مواضع میں طبقات ابن سعد کی وہ روایات لے لی ہیں جن کا پہلا راوی ہی واقدی ہے''۔(۱۰)

اسی طرح سید سلیمان ندوی کے تعلق سے ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی لکھتے ہیں:

''سید ندوی نے حضرت ریحانہ کے ازدواج کے بارے میں تین قسم کی روایتیں بیان کی ہیں، چنانچہ انہوں نے مندہ، ابن اسحاق اور واقدی کی روایات بالترتیب بیان کرنے کے بعد آخر الذکر کو قبول کیا ہے کہ اس کی تائید امام زہری وغیرہ کی روایات سے ہوتی ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ علامہ ندوی واقدی کے بارے میں حسن ظن نہیں رکھتے تھے، تاہم ان کی روایت قبول کرنے میں ان کا سوئے ظن مانع نہیں ہوا کہ وہی روایت ''اثبت'' ہے''۔(۱۱)

وہ مزید لکھتے ہیں:

''اسی طرح انہوں نے بنی نضیر کی جلاوطنی کے بعد بنو قریظہ سے تجدید معاہدہ کا سراغ دینے والی واقدی کی روایت قبول کی ہے''۔(۱۲)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ واقدی کی تضعیف کے باوجود محدثین بعض شرائط کے ساتھ تاریخ، رجال اور سیرت و مغازی میں ان سے استفادے کے قائل رہے ہیں، پھر یہ صرف واقدی کی تخصیص نہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی متعدد روایان حدیث ایسے ہیں جو حدیث میں ضعیف قرار دیے گئے ہیں لیکن سیرت و مغازی میں معتبر ہیں، مثلاً ابو معشر نجیح المدنی، زیاد بن عبد اللہ البکائی، سلمہ بن الفضل الابرش وغیرہ، یہ سب حدیث میں ضعیف اور سیرت و مغازی میں ثقہ ہیں۔

واقدی نے سیرت کے موضوع پر کم از کم چار مستقل کتابیں تصنیف کی تھیں، کتاب التاریخ والمغازی والمبعث، کتاب السیرۃ، کتاب وفاۃ النبی ﷺ اور کتاب ازواج النبی ﷺ، سیرت نگار کی حیثیت سے واقدی کی قدر و قیمت اور خصوصیت و اہمیت کا صحیح اندازہ اسی وقت لگایا جاسکتا تھا، جب متذکرہ بالا چاروں کتابیں ہمارے سامنے موجود ہوتیں لیکن بدقسمتی سے صرف کتاب المغازی یعنی اول الذکر کتاب کا درمیانی حصہ ہی زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آسکا ہے، لہذا ہمارے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں رہ جاتی کہ ہم مطبوعہ کتاب المغازی کے ساتھ طبقات ابن سعد کو بھی پیش نظر رکھ کر سیرت نگار واقدی اور ان کی کتاب المغازی کے بارے میں اہم اور ضروری معلومات فراہم کرنے کی کوشش کریں، یہ طریق کار اس لیے بھی درست ہوگا کہ ابن خلکان کے بیان کے مطابق ابن سعد نے واقدی کی تمام تصانیف کو اپنی ''الطبقات'' میں ضم کرلیا ہے۔(۱۳)

سیرت سے متعلق واقدی کی روایات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ابن اسحاق کے برخلاف آفرینش عالم، سلسلۂ انبیاء ورسل، عربوں کی قدیم تاریخ اور مکہ اور اس کے اطراف و اکناف کے جغرافیے کی طرف زیادہ توجہ صرف نہیں کی ہے بلکہ زمانۂ قبل از اسلام کی تاریخ کے صرف ان ہی موضوعات سے تعرض کیا ہے جن کا سیرت سے براہ راست تعلق تھا، چنانچہ طبقات ابن سعد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر سے لے کر ولادت نبوی تک جن ابواب کے تحت واقدی کی روایات مذکور ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

ذکر ابراهیم علیه السلام - ذکر اسماعیل علیه السلام - ذکر القرون والسنین اللتی بین آدم و محمد علیه الصلوٰة والسلام - ذکر امهات رسول اللّٰہ ﷺ - ذکر قصی بن کلاب - ذکر هاشم بن عبد مناف - ذکر عبد المطلب بن هاشم - ذکر ابرهة الفیل - (۱۴) ذکر نذر عبد المطلب ان ینحر ابنه - ذکر تزوج عبد اللّٰہ بن عبد المطلب آمنة بنت وهب ام رسول اللّٰہ ﷺ - ذکر المراة التی عرضت نفسها علی عبد اللّٰہ بن عبد المطلب - ذکر حمل آمنة برسول اللّٰہ ﷺ کثیرا - ذکر وفاة عبد اللّٰہ بن عبد المطلب - ذکر مولد رسول اللّٰہ ﷺ -

اس فہرست ابواب کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ عرب قدیم کی تاریخ کے سیرت نبوی سے ارتباط کے سلسلے میں واقدی کا طریق کار زیادہ قرین قیاس، مطابق فطرت اور ہمارے عہد کے مزاج سے قریب تر تھا، کیونکہ سیرت ابن اسحاق کے زیر بحث حصے میں پہلے تو ابن ہشام نے بڑے پیمانے پر ترمیم و تنسیخ کا عمل جاری کیا اور اس کے بعد عبدالسلام ہارون نے مزید تراش خراش کے ذریعے اسے اور بھی مختصر بنا دیا لیکن واقدی کے یہاں اس قسم کے عمل جراحی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

ولادت کے بعد سے ہجرت تک آنحضرتؐ کی مکی زندگی سے متعلق واقدی کی روایات کی نوعیت کا اندازہ لگانے کے لیے طبقات ابن سعد کے مندرجہ ذیل ابواب پر ایک نظر ڈالنا مفید ہوگا، کیونکہ ابن سعد نے سلسلۂ زیر بحث میں واقدی کی تمام روایات ان ہی ابواب کے تحت درج کی ہیں:

ذکر اسماء الرسول و کنیته - ذکر من ارضع رسول اللّٰہ ﷺ، وتسمیة اخوته واخواته من الرضاعة - ذکر وفاة آمنة ام رسول اللّٰہ ﷺ - ذکر ضم عبد المطلب

رسول اللّٰہ ﷺ الیہ و ذکر وفاۃ عبد المطلب ووصیۃ ابی طالب برسول اللّٰہ - ذکر ابی طالب و ذمہ رسول اللّٰہ ﷺ - ذکر خروج رسول اللّٰہ ﷺ حرب الفجار - ذکر خروج رسول اللّٰہ ﷺ حلف الفضول - ذکر خروج رسول اللّٰہ ﷺ فی المرۃ الثانیۃ - ذکر تزویج رسول اللّٰہ ﷺ خدیجۃ بنت خویلد - ذکر اولاد رسول اللّٰہ ﷺ و تسمیتھم - ذکر ابراھیم بن رسول اللّٰہ ﷺ تسلیما - ذکر حضور رسول اللّٰہ ﷺ ھدم القریش الکعبۃ وبناء ھا - ذکر نبوۃ رسول اللّٰہ ﷺ - ذکر علامات النبوۃ فی رسول اللّٰہ ﷺ قبل ان یوحی الیہ - ذکر علامات النبوۃ بعد نزول الوحی علی رسول اللّٰہ ﷺ - ذکر مبعث رسول اللّٰہ ﷺ وما بعث بہ - ذکر الیوم الذی بعث فیہ رسول اللّٰہ ﷺ - ذکر نزول الوحی علی رسول اللّٰہ ﷺ - ذکر اول ما نزل علیہ من القرآن - ذکر شدۃ نزول الوحی علی النبی ﷺ - ذکر دعاء رسول اللّٰہ ﷺ الناس الی الاسلام - ذکر مشی قریش الی ابی طالب فی امرہ ﷺ - ذکر ھجرۃ من ھاجر من اصحاب رسول اللّٰہ ﷺ الی ارض الحبشۃ فی المرۃ الاولیٰ - ذکر سبب رجوع اصحاب النبی ﷺ - ذکر الھجرۃ الثانیۃ الی الارض الحبشۃ - ذکر حصر رسول اللّٰہ ﷺ وبنی ھاشم فی الشعب - ذکر سبب خروج رسول اللّٰہ ﷺ الی الطائف - ذکر المعراج و فرض الصلوات - ذکر لیلۃ اسری برسول اللّٰہ ﷺ - ذکر دعاء رسول اللّٰہ ﷺ قبائل العرب فی المواسم - ذکر دعاء رسول اللّٰہ ﷺ - ذکر العقبۃ

الاولیٰ - ذکر العقبة الآخرة - ذکر اذن رسول اللہ ﷺ المسلمین فی الھجرة الی المدینة - ذکر خروج رسول اللہ ﷺ وابی بکر الی المدینة للھجرة -

مکی زندگی سے متعلق واقدی اور ابن اسحاق کی روایات کے تقابلی مطالعے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بحیثیت مجموعی ابن اسحاق کی روایات کی تعداد زیادہ ہے اور بیان بھی ایجاز کے بجائے اطناب کی طرف مائل ہے، اس کے برخلاف واقدی کی روایات تعداد میں کم ہیں، ساتھ ہی ان میں ایجاز واختصار کی کیفیت نمایاں ہے (۱۵)۔ لیکن جہاں تک واقعات کی مناسب ترتیب اور حسن تالیف وترکیب کا تعلق ہے واقدی کو ابن اسحاق پر ترجیح حاصل ہے، چنانچہ ابن اسحاق کے یہاں متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ وہ واقعات کی تاریخی وفطری ترتیب سے واقف وباخبر ہونے کے باوجود انہیں آگے پیچھے ذکر کرجاتے ہیں، واقدی کے یہاں ایسی مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مدنی زندگی کے واقعات سیرت کی کتابوں میں عموماً سنہ وار بیان کیے جاتے ہیں، مثلاً یہ کہ ہجرت کے فلاں سال میں اتنی جنگیں پیش آئیں، اتنے خطوط بھیجے گئے، اتنے وفود آئے، اتنے قبائل یا اشخاص مشرف بہ ایمان ہوئے وغیرہ وغیرہ، ابن اسحاق اور طبری کا یہی طرز ہے، علامہ شبلی نے اس پر تنقید (۱۶) کے باوجود سیرۃ النبی میں اسی کو اختیار کرلیا ہے، لیکن واقدی کا طریق کار اس سلسلے میں بالکل جداگانہ ہے، انہوں نے پہلے مدنی زندگی کے عمومی واقعات ایک جگہ بیان کردیے ہیں، اس کے بعد بالترتیب آنحضرتؐ کے بعثات، مکاتیب اور آپؐ کے پاس آنے والے وفود کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد تمام غزوات وسرایا کو ایک جگہ بیان کردیا ہے، آخر میں حجۃ الوداع کا ذکر کرتے ہوئے آپؐ کی علالت، وفات اور تدفین وغیرہ کی تفصیلات کے بیان پر سلسلۂ کلام کو ختم کردیا ہے۔

مدنی زندگی کے عمومی واقعات سے متعلق واقدی کی روایات طبقات ابن سعد میں درج ذیل عنوانات کے تحت نقل کی گئی ہیں:

ذکر مواخاة رسول اللہ ﷺ بین المھاجرین

والانصار - ذکر بناء رسول اللّٰہ ﷺ المسجد بالمدینة - ذکر صرف القبلة من بیت المقدس الی الکعبة - ذکر المسجد الذی اسس علی التقوی - ذکر الاذان - ذکر فرض شهر رمضان ، و زکوٰة الفطر ، وصلاة العیدین وسنة الاضحیة - ذکر منبر رسول اللّٰہ ﷺ - ذکر الصفة ومن کان فیها - ذکر الموضع الذی کان یصلی فیه رسول اللّٰہ ﷺ علی الجنائز -

ابن سعد نے آنحضرتؐ کے بعثات اور مکاتیب کا ذکر الگ الگ عنوانات کے بجائے ایک ہی عنوان کے تحت کردیا ہے۔ان میں سے واقدی کے ذکر کردہ بعثات و مکاتیب کی فہرست تیار کرنے کے لیے ہم اپنے طور پر درج ذیل عنوانات قائم کرسکتے ہیں:

ذکر بعثه ﷺ عمر و بن امیه الضمری الی النجاشی وکتابه الیه - ذکر بعثه ﷺ دحیة بن خلیفة الکلبی الی قیصر الرم وکتابه الیه - ذکر بعثه ﷺ عبد اللّٰہ بن حذافة السهمی الی کسری و کتابه الیه - ذکر بعثه ﷺ حاطب بن ابی بلتعة اللخمی الی المقوقس صاحب الاسکندریة وکتابه الیه - ذکر بعثه ﷺ شجاع بن وهب الاسدی الی الحارث بن ابی شمر الغسانی وکتابه الیه - ذکر کتابه ﷺ الی فروة بن عمرو الجذامی ردا علی کتابه و بعثه - ذکر بعثة ﷺ سلیط بن عمرو العامری الی هوذة بن علی الحنفی وکتابه الیه - ذکر بعثه ﷺ عمرو بن العاص الی جیفر و عبد ابنی الجلندی الازدیین وکتابه الیهما - ذکر بعثه ﷺ العلا بن الحضرمی وابی هریرة الی المنذر بن ساوی العبدی وکتابه الیه - ذکر کتبه ﷺ الی عدة من اهل الیمن -

اب دیکھنا یہ ہے کہ ابن اسحاق کے مقابلے میں واقدی کے امتیازات کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ ابن اسحاق باوجودیکہ واقدی سے مقدم ہیں اور زمانۂ مابعد کے سیرت نگاروں نے زیادہ تر انہیں پر اعتماد بھی کیا ہے لیکن ابن اسحاق کے مقابلے میں انہیں کئی حیثیتوں سے ترجیح حاصل ہے۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی چیز احساس تناسب وتوازن ہے، ابن اسحاق اور واقدی کا موازنہ کریں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اول الذکر کے مقابلے میں ثانی الذکر میں تناسب وتوازن کا مادہ زیادہ تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ واقعات سیرت کے لیے تمہید کے طور پر زمانہ ماقبل از اسلام کے حالات وواقعات کا بیان دونوں کے یہاں ملتا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اول الذکر کے یہاں واقعات ضرورت سے زیادہ پھیل گئے ہیں، اس کے برخلاف ثانی الذکر نے ان واقعات کے سلسلے میں بہ قدر ضرورت کے اصول پر عمل کرتے ہوئے صرف ان ہی مباحث سے تعرض کیا ہے جن کا سیرت نبوی سے براہ راست تعلق تھا۔

یہی بات اشعار کے نقل وروایت کے سلسلے میں بھی کہی جاسکتی ہے، ابن اسحاق کا قدم یہاں بھی جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا ہے، چنانچہ محمد بن سلام الجمحی اور ابن ندیم نے اس سلسلے میں ان پر سخت تنقیدیں کی ہیں، ممکن ہے یہ اعتراضات ہر جگہ درست نہ ہوں، تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ ابن اسحاق مختلف حالات وواقعات کے آگے پیچھے اس کثرت سے اشعار نقل کرتے ہیں جس سے ایک طرف بیانیہ کی روانی مجروح ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ اشعار کے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑ سکتے لیکن واقدی کے یہاں یہ کیفیت نہیں پائی جاتی، اول تو انہوں نے اشعار اس قدر کم نقل کیے ہیں کہ سلسلہ کلام میں اس سے کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، دوسرے جابہ جا ان کی سند بھی بیان کردی ہے، مزید برآں بعض مقامات پر ان کے استناد یا عدم استناد کی وضاحت بھی کردی ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

غزوۂ بدر میں قریش کے مقتولین کے بارے میں کعب بن اشرف کے مرثیے کے چند اشعار نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال الواقدی املاها علی عبد اللّٰہ بن جعفر و محمد

بن صالح و ابن ابی الزناد الخ۔(۱۷)

شہدائے بیر معونہ کے مراثی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

قال عبد اللّٰہ بن رواحة یرثی نافع بن بدیل ،

وسمعت اصحابنا ینشدونها۔(۱۸)

اسی ضمن میں انس بن عباس السلمی کے چند اشعار نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: سمعت اصحابنا یثبتونها۔(۱۹)

کعب بن اشرف کے قتل کے سلسلے میں عباد بن بشر کی جانب منسوب بعض اشعار کے نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: قال ابن ابی حبیبة انا رایت قائل هذا الشعر ، قال ابن ابی الزناد ، لولا قول ابن ابی حبیبة لظننت انها ثبت۔(۲۰)

ان مثالوں کی روشنی میں اشعار کے نقل و روایت کے باب میں ابن اسحاق اور واقدی کے طریق کار کے فرق کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے، احساس تناسب و توازن کے ساتھ ساتھ مواد کی بہتر سے بہتر ترتیب و تنظیم کے سلسلے میں بھی واقدی کو ابن اسحاق پر ترجیح حاصل ہے، اس سلسلے میں امور ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

الف: واقعات سیرت کے بیان میں ابن اسحاق نے سلاطین کی تاریخ اور ان کے سال ناموں کی طرح صرف زمانی ترتیب کا لحاظ رکھا ہے، اس لیے ان کے یہاں کسی خاص موضوع سے متعلق تمام روایات یک جا طور پر نہیں ملتیں ، مثلاً اگر یہ دیکھنا ہو کہ آنحضرتؐ نے کن کن بادشاہوں یا گورنروں کے نام سفارتیں بھیجیں؟ کن کن کے نام خطوط روانہ فرمائے؟ کن کن قبیلوں یا ان کے افراد نے اپنے حق میں آپؐ سے تحریریں حاصل کیں؟ کہاں کہاں سے آپؐ کی خدمت میں وفود آئے؟ آپؐ کی فوجی مہمیں کل کتنی تھیں اور ان کی تفصیلات کیا ہیں ؟ تو ان سوالات کے جواب کے لیے پوری ''سیرۃ ابن اسحاق'' کی ورق گردانی کرنی ہوگی ، کیونکہ ابن اسحاق نے ان تمام واقعات کو خلط ملط کر کے بیان کیا ہے، اس کے برخلاف واقدی نے بعثات و مکاتیب ، وفود اور غزوات و سرایا وغیرہ میں سے ہر ایک کو تاریخی ترتیب کے ساتھ ایک ہی جگہ جمع کر دیا ہے، اس

لیے ان کا قاری کسی خاص موضوع سے متعلق تمام تفصیلات ایک ہی جگہ پالیتا ہے، ساتھ ہی اسے ہر واقعے کا زمانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

ب: اس سلسلے میں واقدی کا دوسرا قابل ذکر وصف یہ ہے کہ وہ واقعات کو پہلے اجمالاً پھر تفصیلاً بیان کرتے ہیں، مثلاً تمام غزوات وسرایا کے بارے میں انہوں نے پہلے اجمالی طور پر یہ بتا دیا ہے کہ کون کون سے غزوات اور سریے کس ترتیب کے مطابق اور کس سنہ میں پیش آئے، اس کے بعد اسی ترتیب کے مطابق ان میں سے ہر ایک کی تفصیلات بیان کی ہیں، مزید برآں ہر غزوے اور سریے کے بیان میں بھی عموماً اجمال و تفصیل کا یہی انداز اختیار کیا ہے، اس سلسلے کی بہترین مثالیں غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور سریہ سلمہ بن عبدالاسد کے بیان میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ج: حسن ترتیب و تنظیم کے سلسلے میں واقدی کے تفوق کا اندازہ لگانے کے لیے ''علامات النبوۃ قبل نزول الوحی'' سے متعلق ابن اسحاق اور واقدی کے سیاق روایات کا تقابلی مطالعہ بھی مفید ہوگا، اس موضوع پر واقدی کا بیان اجمال و اختصار کے باوجود ایک تو ولادت باسعادت سے لے کر بعثت تک کے اکثر واقعات کو محیط ہے، دوسرے فطری ترتیب کے مطابق بھی ہے، اس کے برخلاف ابن اسحاق عرب کے کاہنوں اور علمائے یہود و نصاریٰ کے بیانات کی جانب زیادہ متوجہ ہو گئے ہیں، جس کی بنا پر تفصیل و اطناب کے باوجود ان کے یہاں بہت سے قابل ذکر واقعات چھوٹ گئے ہیں، مزید برآں حضرت سلمان فارسی کی سوانح حیات اور پھر ان کے قبول اسلام کے واقعے کو علامات نبوت کے ذیل میں بیان کرنے کی وجہ سے فطری ترتیب و واقعات کی کما حقہ رعایت نہیں ہو سکی ہے، اسی طرح حلف الفضول کو ادنی مناسبت کی بنا پر ابن اسحاق نے حلف المطیبین کے بعد ذکر کر دیا ہے، حالانکہ اول الذکر کا تعلق زمانہ جاہلیت سے ہے اور ثانی الذکر اس وقت پیش آیا جب کہ آنحضرتؐ کی عمر مبارک بیس سال کی تھی اور آپؐ بہ نفس نفیس اس میں شریک تھے، واقدی نے اس کا ذکر اپنے اصل موقع پر یعنی حرب الفجار کے بعد کیا ہے۔

ابن اسحاق کے مقابلے میں واقدی کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ سیرت کے اکثر اہم واقعات ان کے یہاں کئی کئی سندوں سے مذکور ہیں، اس کے برخلاف ابن اسحاق نے ان واقعات کو عموماً ایک ہی سند سے ذکر کیا ہے، چنانچہ وفات عبدالمطلب، کفالت ابو طالب، بیت اللہ کی تعمیر

جدید، سفر طائف، موسم حج میں دورۂ قبائل، بیعت عقبۂ ثانیہ، مشورۂ قتل و ہجرت اور اذان کی ابتدا کے واقعات ابن اسحاق نے ایک سند سے اور واقدی نے کئی کئی سندوں سے ذکر کیے ہیں، اس کے علاوہ تمام بعثات و مکاتیب اور اکثر غزوات و سرایا کے سلسلے میں بھی ابن اسحاق نے عموماً ایک سند اور واقدی نے کئی کئی سندیں ذکر کی ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ابن اسحاق نے سیرت کے بعض اہم واقعات بلاسند یا ناقص سندوں کے ساتھ ذکر کیے ہیں لیکن واقدی نے ان کے بیان میں بھی حسب معمول کئی کئی سندیں جمع کر دی ہیں، مثلاً وفات حضرت آمنہ، حرف فجار، حضرت خدیجہ سے نکاح، ابوطالب کے پاس وفد قریش کی آمد اور گفتگو، شعب ابوطالب میں محصوری، بیعت عقبۂ اولیٰ، مواخاۃ اور تحویل قبلہ کے واقعات ابن اسحاق کے یہاں بغیر سند کے مذکور ہیں، اسی طرح اسراء، انصار کے اسلام کی ابتدا اور ہجرت کے واقعات ناقص سندوں کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں لیکن واقدی نے ان تمام واقعات کو کئی کئی سندوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

واقدی کا یہ وصف بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے سیرت سے متعلق بعض ایسے موضوعات پر بھی روایات جمع کر دی ہیں جن سے ابن اسحاق نے کوئی تعرض ہی نہیں کیا ہے، مثلاً آنحضرتؐ کے لیے منبر کا بنایا جانا، حبشہ کی دوسری ہجرت، تحویل قبلہ کے بعد مسجد قبا کی اصلاح اور اس کے فضائل و مناقب کا ذکر صرف واقدی نے کیا ہے، اسی طرح آپؐ کی تلواروں، زرہوں، نیزوں، گھوڑوں، اونٹوں، بھیڑوں، بکریوں، خادموں، غلاموں، مکانوں، ازواج مطہرات کے حجروں اور اوقاف و صدقات وغیرہ کے سلسلے میں واقدی نے مستقل ابواب کے تحت جو تفصیلات فراہم کر دی ہیں، ابن اسحاق کے یہاں ان کا سراغ نہیں ملتا، صفہ اور اصحاب صفہ کے حالات اور ابراہیم بن رسول اللہ کا تفصیلی ذکر بھی صرف واقدی نے کیا ہے، جب کہ ابن اسحاق نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔

اسی طرح دعوت اسلام کے سلسلے میں نجاشی، قیصر روم، خسرو پرویز، عزیز مصر، رئیس غسان، رئیس یمامہ اور دیگر سلاطین و روسا کے نام آنحضرتؐ کی سفارتوں اور مکاتیب کا ذکر ابن اسحاق کے یہاں موجود نہیں لیکن واقدی نے تاریخی ترتیب کی رعایت کرتے ہوئے ان میں سے

ہر ایک کا علاحدہ علاحدہ، نامہ، نامہ بر اور اثر نامہ کی تفصیلات کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ آپؐ کے دیگر مکاتیب اور عام تحریروں کا ذکر بھی واقدی کے مقابلے میں ابن اسحاق کے یہاں کم ہے، چنانچہ واقدی کے یہاں مذکور آپؐ کے مکاتیب اور دیگر تحریروں کی مجموعی تعداد ۲۷، اور ۶۴ ہے، اس کے برخلاف ابن اسحاق کے یہاں یہ تعداد بالترتیب ۵، اور ۵ ہے، اسی طرح واقدی نے جن مکاتیب یا تحریروں کے متن بھی نقل کیے ہیں وہ تعداد میں ۳۹ ہیں، ابن اسحاق کے یہاں یہ تعداد ۹ تک محدود ہے، یہی حال آپؐ کے پاس آنے والے وفود کا بھی ہے، واقدی نے ان میں سے ۴۱ کا ذکر کیا ہے اور ابن اسحاق نے ۱۴ کا، حاصل یہ ہے کہ کثرت روایات، جامعیت اور وسعت معلومات کے لحاظ سے بھی واقدی کو ابن اسحاق پر ترجیح حاصل ہے۔

متذکرہ بالا تفصیلات کی روشنی میں واقدی اور ان کی مرویات سیرت کی اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حواشی

(۱) تاریخ بغداد، دارالکتب العربی، بیروت، سنہ ندارد، ۳/۳-۲۱۔

(۲) ایضاً، بحوالۂ بالا۔

(۳) ایضاً۔

(۴) ایضاً۔

(۵) الصارم المسلول علی شاتم الرسول، تلخیص محمد محی الدین عبدالحمید، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۷۸ء، ص ۹۷۔

(۶) تلخیص الحبیر، مطبع انصاری دہلی، ۱۳۰۷ھ، ص ۲۳۱۔

(۷) آثار السنن، ص ۷، بحوالہ اعلام السنن، ظفر احمد تھانوی، تحقیق محمد تقی عثمانی، مکتبہ دار العلوم کراچی، پاکستان، طبع دوم، ۱۳۸۶ھ، ۱/۲۸۲

(۸) امانی الاحبار فی شرح معانی الآثار، مکتبہ یحیویہ سہارن پور، طبع اول، ۱۳۷۹ھ، ۱/۱۴۔

(۹) المستدرک للحاکم، تحقیق مصطفیٰ عبدالقادر، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۰ء۔

(۱۰) سیرۃ المصطفیٰ، ربانی بک ڈپو دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۸۸۔

(۱۱و۱۲) ''تنقیدی بصیرت بحوالہ سیرت النبی''، مشمولہ مطالعہ سلیمانی، مرتبہ مسعودالرحمٰن خاں ندوی طبع اول، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۱۔

(۱۳) وفیات الاعیان، تحقیق احسان عباس، دارالثقافۃ، بیروت، ۱۹۷۲ء (ترجمہ محمد بن سعد کاتب الواقدی)۔

(۱۴) یہ باب طبقات میں موجود نہیں لیکن طبری نے ابن سعد ہی کے واسطے سے اس باب سے متعلق واقدی کی ایک روایت نقل کی ہے، اسی لیے یہ عنوان قلابین میں درج کیا گیا ہے۔

(۱۵) بعض شواہد و قرائن کی بناپر ہمارا خیال ہے کہ ابن سعد نے مکی زندگی سے متعلق واقدی کی روایات کی تعداد کو تو عموماً جوں کا توں برقرار رکھا ہے لیکن ان کے متن میں اکثر و بیشتر حذف و اختصار سے کام لیا ہے۔

(۱۶) اس موقع پر علامہ شبلی کے الفاظ یہ ہیں ''ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ سلاطین کی تاریخ کی طرح سنین کو عنوان بناتے ہیں اور اسی ترتیب سے حالات لکھتے ہیں- یہ طریقہ اگرچہ سلطنت و حکومت کی تاریخ کے لیے بھی صحیح نہ تھا لیکن نبوت کی سوانح نگاری کے لیے تو ناموزوں ہے''۔ (سیرۃ النبی: ۱/۶۸)

(۱۷) المغازی للواقدی، تحقیق دکتور مارسدن جونس، عالم الکتب، بیروت، ۱۹۶۶ء، ۱/۱۱۶۔

(۱۸) ایضاً بحوالہ بالا، ۱/۳۴۴۔

(۱۹) ایضاً بحوالہ بالا، ۱/۳۴۴۔

(۲۰) ایضاً بحوالہ بالا، ۱/۱۹۰۔

القاب صحابہ کی معنویت

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

انسانی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں ہر فرد اپنی صلاحیت کے لحاظ سے بلاشبہہ کردار ادا کرتا ہے۔ بعض افراد کسی خاص شعبہ میں ایسی بے مثال خدمات سرانجام دیتے ہیں کہ وہی خدمت ان کی پہچان بن جاتی ہے۔ لقب درحقیقت ان خدمات کا لفظی اعتراف ہوتا ہے۔ لقب اس انسان کے حقیقی نام کے علاوہ اس کی پہچان ہوتا ہے۔ ابن الجوزی (۱) کے بقول الالقاب جمع لقب، وھو اسم یدعی بہ الانسان سوی الاسم الذی سمی بہ۔

لقب کسی آدمی کی قدر و منزلت اور شخصی اوصاف کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ فیروز آبادی کا نقل کردہ یہ شعر اس بات کو مزید واضح کرتا ہے:

وقلما ابصرت عیناک ذالقب

الا ومعناہ ان فتشت فی لقبہ

تم نے کسی صاحب لقب کو نہیں دیکھا ہوگا مگر ذرا تلاش کرنے پر اس کے اوصاف اس کے لقب میں مل سکتے ہیں۔

قرآن کریم نے ولا تنابزوا بالالقاب (الحجرات:۱۱) کے ذریعہ کسی کو برے القاب سے یاد کرنے کو منع فرمایا۔ اس سے یہ نتیجہ واضح ہے کہ اچھا لقب ضرور رکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ کبار صحابہ میں سے جس میں جو وصف اور کمال دوسرے سے زائد ہوتا اس کو اسی لقب سے ملقب فرماتے۔ امین الامت ابوعبیدۃ بن الجراح کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ عینی نے اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

چیرمین شعبہ عربی و اسلامیات، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

والنبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم خص کل واحد من کبار الصحابة بفضيلة واحدة وصفه بها فاشعر بقدر زائد فيها على غيره ۔ (۲)

مفسرین نے ان القاب کی درج ذیل مثالیں بھی بیان کی ہیں:

امام قرطبی لکھتے ہیں:

الا ترى ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم لقب عمر بالفاروق ، وأبا بكر بالصديق وعثمان بذى النورين و خزيمة بذى الشهادتين وابا هريرة بذى الشمالين وبذى اليدين فى اشباه ذلك۔

ایک روایت نقل کرنے کے بعد امام موصوف لکھتے ہیں:

وحمزة باسد اللّٰه وخالد بسيف اللّٰه ۔ (۳)

علامہ آلوسی کے مطابق حضرت علیؓ کا لقب کرم اللہ وجہہ بھی ہے۔(۴)

امام قرطبی نے اس حقیقت کو بھی بیان فرمایا کہ آپ جس صحابی کے لئے کسی وصف کو بیان فرمادیتے وہ اس کے لئے عظیم ترین اعزاز ہو جاتا۔

وقدوصف رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیہ وآلہٖ وسلم عددا من اصحابه بأوصاف صارت لهم من أجل الالقاب ۔(۵)

یہ القاب مفرد اور مرکب دونوں قسم کے ہیں جیسے صدیق، سید اور امین ہذہ الامہ وغیرہ، گروہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور فرد سے بھی جسے مہاجرین وانصار اور حواری رسول وغیرہ، صحابہ کرام کے علاوہ آپؐ نے بعض صحابیات کو بھی ان کے مقام ومرتبہ، خدمت خلق اور ذاتی شرف کے پیش نظر القاب عطا فرمائے ۔آپؐ کے بعد علمائے امت نے بھی بعض صحابہ کرام کو ان کے اوصاف حسنہ اور خدمات جلیلہ کے عوض اچھے القاب سے یاد کیا ہے، جیسے ساقی الحرمین اور ذوالنورین وغیرہ۔ ذیل میں صحابہ وصحابیات کے چند القاب مع پس منظر ووجہ تسمیہ ولقب کے درج کیے جاتے ہیں:

۱- ایسے القابات جو کسی گروہ / جماعت صحابہ کے ہیں۔

صحابی: نبی کریم ﷺ سے براہِ راست فیض یاب ہونے والی جماعت کا معروف ترین لقب ''صحابی'' ہے۔ رضوان الٰہی کا مژدہ جانفزا اسی گروہ کو سنایا گیا۔ تورات اور انجیل میں اسی برگزیدہ گروہ کے اوصاف وکمال کا ذکر کیا گیا۔ (سورۃ الفتح:۲۹)

صحابی کا لقب خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عطا کردہ ہے۔ حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبرستان تشریف لے گئے اور فرمایا: السلام علیکم اے مومنو! ہم بھی ان شاء اللہ تمہارے پاس آنے والے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ ہم اپنے دینی بھائیوں کو دیکھیں صحابہ نے عرض کی او لسنا اخوانك یَارَسُول الله کہ کیا ہم آپ کے دینی بھائی نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا: انتم اصحابی واخواننا الذین لم یاتوا بعد تم میرے صحابہ ہو اور ہمارے دینی بھائی وہ لوگ ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو امت کے لیے امان قرار دیا۔ (۶)

آپ نے ان لوگوں کے بارہ میں خَیرُ اُمّتی فرمایا۔ (۷)

ان ہی فضائل وکمالات کی بنا پر صحابہ کا خرچ کیا ہوا ایک کلوگرام دوسروں کے احد پہاڑ کے سونے سے بھی بہتر ہے۔ اسی علوشان کی وجہ سے سبّ وشتم صحابہ کو جرم قرار دیا۔ (۸)

فضائل ومناقب صحابہ کے اس تذکرہ کے بعد صحابی کی تعریف سمجھنا بھی ضروری ہے۔ ابن حجر کے نزدیک اس کی صحیح ترین تعریف یہ ہے کہ جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت ایمان میں زیارت کی اور اسی حالت پر اسے موت آئی۔

أن الصحابی من لقی النبی صلی الله علیه وآلہ وسلم مومنابه ومات علی الاسلام۔ (۹)

صحابی کی معرفت کے ذرائع درج ذیل ہیں: (۱۰)

۱- تواتر: حضرت ابوبکر، حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور عشرہ مبشرہ کے بارہ میں تواتر سے معلوم ہے کہ وہ صحابی ہیں۔

۲- استفاضۃ: وہ صحابہ جن کی شہرت تواتر سے کم درجہ کی ہو جیسے ضمام بن ثعلبہ اور عکاشہ بن محصن۔

۳۔صحابی کا قول: کوئی صحابی یہ گواہی دے کہ فلاں شخص صحابی ہے۔ حضرت حممۃ بن ابوحممۃ الدوسی اصبہان میں پیٹ کی بیماری سے فوت ہوئے۔ آپ کے بارہ میں حضرت ابوموسی اشعری نے شہادت دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ شہید ہوں گے۔

۴۔تابعی کی خبر: کوئی تابعی بتائے کہ فلاں شخص صحابی ہے۔

۵۔کوئی شخص بشرط ثبوت ودلائل صحابی ہونے کا دعویٰ کرے مگر نبی کریمؐ کے وصال کے سو سال بعد کسی کا دعوائے صحابیت قبول نہ ہوگا۔

علماء نے صحابہ کے بارہ طبقات کی تقسیم اس طرح کی ہے:

۱۔وہ اصحاب جنہوں نے مکہ میں اسلام قبول کرنے میں پہل کی جیسے خلفائے اربعہ۔ ۲۔وہ اصحاب جنہوں نے دارالندوہ میں کفار کے اجلاس سے پہلے اسلام قبول کیا۔ ۳۔حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے۔ ۴۔اصحاب بیعت عقبہ اولی۔ ۵۔اصحاب بیعت عقبہ ثانیہ۔ ۶۔اولین مہاجرین جو قباء میں نبی کریمؐ سے مدینہ منورہ میں داخلہ سے پہلے ملے۔ ۷۔اہل بدر۔ ۸۔غزوہ بدر اور صلح حدیبیہ کے درمیان ہجرت کرنے والے۔ ۹۔بیعت رضوان کے شرکاء۔ ۱۰۔صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے ہجرت کرنے والے۔ ۱۱۔فتح مکہ میں اسلام قبول کرنے والے۔ ۱۲۔وہ بچے جنہوں نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپؐ کی زیارت کی۔(۱۱)

مہاجرین: یہ صحابہ کرام کے اس گروہ کا لقب ہے جنہوں نے نبی کریمؐ کے لیے اپنا وطن اور قبیلہ چھوڑ مدینہ کی جانب ہجرت کی، اور مدینہ میں جنہوں نے ان کی مدد کی انہیں انصار کا لقب دیا گیا۔ جس کی تفصیل آئندہ سطروں میں آرہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین وانصار میں سے سابقین اولین اور ان کے پیروکاروں کے لئے اپنی رضا، جنت اور فوز عظیم کی خوشخبری سنائی۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ	مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے اور جنہوں نے اچھائی کے ساتھ ان کی پیروی کی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لیے جنتیں تیار کیں جن کے نیچے دریا جاری

خَالِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔ (سورۃ توبہ:۱۰۰)
ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے یہ عظیم کامیابی ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے لکھا ہے کہ مہاجرین اولین کا مرتبہ انصار مدینہ سے کئی وجہ سے افضل ہے۔

۱۔مہاجرین سابقین انصار اور باقی مسلمانوں سے اس لیے افضل ہیں کہ وہ سب سے پہلے ایمان لائے اور ان کا ایمان لانا ہی تمام فضیلتوں کا مبدء اور منبع ہے۔ ۲۔مہاجرین اولین مسلسل تیرہ سال کفار قریش کی زیادتیوں اور ظلم وستم کا شکار ہوتے رہے اور تمام سختیوں پر صبر کرتے رہے۔ ۳۔انہوں نے اسلام اور رسول اللہ کی خاطر اپنا وطن، عزیز واقارب، گھر بار، تجارت اور باغات غرض سب کچھ چھوڑا اور اسلام ہی کی خاطر تمام طرح کے مصائب برداشت کئے۔ ۴۔ رسول اللہ کے پیغام اور شریعت کو قبول کرنے کا دروازہ مہاجرین اولین نے کھولا۔انصار نے ان کی اقتداء کی اور ان کی مشابہت اختیار کی اور مقتدیٰ مقتدی سے افضل ہوتا ہے۔(۱۲)

اس سلسلہ میں علامہ طیبی کی عبارت درج ذیل ہے:

ولكن لايبتغون رتبة المهاجرين السابقين الذين أخرجوا من ديارهم،وقطعوا عن احبابهم واقاربهم وحرموا اوطانهم واموالهم وهم رضوان الله عليهم ما بالوا بذلك بآلة لاجل رضى الله ورضى رسولهٗ ، واعلاء لدين الله وسنة رسوله۔ (۱۳)

انصار: صحابہ میں وہ خوش بخت انفاس جنھوں نے مدینہ منورہ میں خاتم المرسلین اور مہاجرین کی مہمان نوازی کا شرف حاصل کیا انہیں انصار کا لقب عطا ہوا۔

قرآن کریم نے درج ذیل الفاظ میں ان کی نصرت واعانت کا تذکرہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ ایسے مددگاروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی رزق ملتا ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا نَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ
اور جن لوگوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور ان کی نصرت کی یہی لوگ حقیقت میں

کَرِیْمٌ ۔ (الانفال:۷۴) مومن ہیں ان کے لئے بخشش اورعزت والی روزی ہے۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ انصار نام خود اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔(۱۴)

انصار کے فضائل و مناقب آقا کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بیان فرمائے۔انصار سے اظہار محبت ان الفاظ میں فرمایا:

انتم من احب الناس الیّ مجھے لوگوں میں سب سے زیادہ تم محبوب ہو۔(۱۵)

لطف وکرم اور محبت کا یہ انداز بھی ملاحظہ ہو، اگر انصار کسی میدان یا گھاٹی میں چلیں تو میں بھی ان کے ساتھ میدان اور گھاٹی میں چلوں ولولا الهجرة لكنت امرأ من الانصار اور اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار کا فرد ہوتا۔(۱۶)

علامہ طیبی کے بقول یہ انصار کی عزت افزائی ہے اور آپؐ نے لوگوں کو ان کے اکرام واحترام کی رغبت دلائی ہے۔(۱۷) ان کے لئے دعائے مغفرت کی تو سحاب جودوکرم ہی برسا دیا:

اللهم اغفر للانصار و لابنآء الانصار وابنآء ابنآء الانصار ۔ (۱۸) اے اللہ! انصار، ان کے بیٹوں اور ان کے پوتوں کی مغفرت فرما۔

ایک روایت میں ولموالی الانصار یعنی انصار کے غلاموں کی مغفرت فرما۔(۱۹)

آپ نے انصار کو اپنا معتمد خاص قرار دیا اور ان کے جذبہ ایثار وقربانی کی قدر کرتے ہوئے امت کو یہ نصیحت کی:

اور مسلمان بڑھتے رہیں گے اور انصار کم ہوتے رہیں گے۔تم ان کی نیکیوں کو قبول کرنا اور ان کی لغزشوں سے درگزر کرنا۔(۲۰)

آپ کا ارشاد ہے کہ انصار کے تمام گھرانوں میں خیر ہے۔ وفی کل دور الانصار خیر۔(۲۱)

مگر اس کے باوجود ان کی فضیلت کی ترتیب یہ ارشاد فرمائی۔ خیر دور الانصار

بنو النجار سب سے بہتر گھر بنونجار کا ہے پھر بنوعبد الاشھل، پھر بنوالحارث بن خزرج، اور بنوساعدہ۔

چونکہ انصار کی محبت ایمان اور ان سے بغض نفاق کی علامت ہے۔ (۲۲)

اس لئے صحابہ انصار کا حد درجہ احترام کرتے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خادم رسول حضرت انس بن مالک اور حضرت جریر بن عبداللہ بجلی اکٹھے سفر کر رہے تھے اور جریر، حضرت انس کی خدمت کر رہے تھے۔ حضرت انس نے انہیں یہ کہہ کر خدمت گزاری سے منع کیا کہ میں نے جب سے انصار کو رسول اللہؐ کی خدمت کرتے ہوئے دیکھا ہے تو میں نے قسم کھائی کہ جب بھی کسی انصاری کے ساتھ جاؤں گا اس کی خدمت کروں گا۔ (۲۳)

عشرہ مبشرہ: یہ وہ دس خوش نصیب صحابہ ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک ہی مجلس میں جنت کی نوید سنائی۔ سعید بن زید سے روایت ہے:

> کان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عاشر عشرۃ فقال : ابو بکر فی الجنۃ ، و عمر فی الجنۃ ، و عثمان فی الجنۃ ، و علی فی الجنۃ ، و طلحۃ فی الجنۃ ، و الزبیر فی الجنۃ و عبد الرحمن فی الجنۃ ، فقیل لہ من التاسع قال أنا ۔(۲۴)

حضرت شیخ عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''ابوبکر وعمر وعثمان وعلی وطلحہ وزبیر وسعد ابن ابی وقاص وعبدالرحمٰن ابن عوف وابی عبیدۃ بن الجراح وسعید بن زید ایں دہ تن از صحابہ مشہورند بہ عشرۂ مبشرہ از جہت بشارت دادن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایشان را بجنت''۔(۲۵)

اہل البیت: اہل بیت تین طرح کے ہیں:

۱- اہل بیت ولادت: یعنی حضرت فاطمہ۔ ۲- اہل بیت سکنیٰ: ازواج مطہرات۔

۳- اہل بیت نسب: بنو ہاشم

اصحاب بدر: حق و باطل کے پہلے معرکہ (۲ ہجری) میں جن ۳۱۳ (۲۶) اصحاب رسول نے حق کی نمائندگی کرتے ہوئے اس دن کو یوم الفرقان بنایا، ان کی جاں نثاری کا رسول اکرمؐ نے یہ صلہ دیا:

اعملوا ما شئتم فقد وجبت لکم الجنة او فقد غفرت لکم۔ (۲۷)	اے اہل بدر! اب تم جو بھی کرو تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے جنت واجب کردی ہے یا تمہیں معاف کردیا ہے۔

حافظ ابن حجر "اعملوا" کی وضاحت کرتے ہوئی لکھتے ہیں: للتشریف و التکریم والمراد عدم اخذة بما یصدر فهم بعدذلك۔ (۲۸)

اس غایت درجہ تعظیم و تکریم کی بنا پر خود آپؐ اور ان ۳۱۳ نفوس قدسیہ کو اصحاب بدر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نبی کریمؐ نے اصحاب بدر کو افضل المسلمین بھی قرار دیا ہے۔ (۲۹)

اصحاب الشجرۃ: اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے چودہ سو سے زائد (۳۰) جاں نثاروں نے حدیبیہ کے مقام پر ایک درخت کے نیچے بیعت کرکے عزم واستقامت کی داستان رقم کی۔ قرآن کریم نے اس گروہ کو اللہ کی رضا کی بشارت ان الفاظ میں دی۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ۔ (سورۃ الفتح:۱۸)	بے شک اللہ ایمان والوں سے راضی ہوا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کررہے تھے۔

ان نفوس مطہرہ کو نبی کریمؐ نے اصحاب الشجرہ کے لقب سے یاد کیا اور رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ کی وضاحت اس حدیث میں فرمائی: لایدخل النار ان شاء الله من اصحاب الشجرة ۔ (۳۱) ان شاء اللہ اصحاب شجرہ میں سے کوئی شخص جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔

اہل الصفۃ / اضیاف الاسلام: اہل صفہ سے مراد وہ صحابہ کرام ہیں جو فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے پاس رہنے کی کوئی جگہ نہ تھی یہ سب لوگ مسجد نبوی کے پچھلے حصے میں شمال کی طرف ایک سایہ دار جگہ میں سکونت رکھتے۔ ان کی تعداد دس سے کم ہوتی اور بعض

اوقات ۴۰۰ تک جا پہنچتی۔ (۳۲)

حضرت ابوہریرہ کی ایک طویل روایت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ اہل صفہ کو بلاؤ تا کہ دودھ کے ایک پیالہ سے وہ بھی سیراب ہو جائیں۔ اس روایت میں ان نفوس قدسیہ کے لئے اہل الصفہ اور أضیاف الاسلام دونوں القاب آئے ہیں۔

الحق اهل الصفة فادعهم فهم أضياف الاسلام۔ (۳۳)

(ب) وہ القاب جو آپؐ نے منفرداً کسی صحابی کو عطا کیا۔

صدیق: حضرت ابوبکرؓ کا معروف ترین اور زبان زدعام لقب ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے اس لقب کے حوالہ سے قاضی سلمان منصور پوری کی تحقیق ہدیہ قارئین ہے۔ اس میں ضمناً آپ کے دو دیگر القاب (ثانی اثنین اور خلیفۂ رسول) کا بھی تذکرہ ہے۔ فرماتے ہیں:

صدیق معرفت صدق کا عارف ہوتا ہے۔ اس کے احوال واقوال، عزم وارادہ مستقیم، احسن، قوی اور راسخ ہوتے ہیں۔ اس کا واحد مقصود ''رضائے حق'' ہوتا ہے یہ وہ کمال ہے جو کمال نبوت سے ملا ہوا ہے۔ یہ وہ سراج ہے جو چراغ نبوت سے روشن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ ۔

خدا اور رسول کی اطاعت کرنے والوں کو اللہ کے انعام یافتہ بندوں یعنی انبیاء اور صدیقوں کی معیت دی جاوے گی۔

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں صدیقیت ومحدثیت پر بحث لطیف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صدیق اصل فطرت میں ذات پاک نبی سے قریب تر ہوتا ہے وہ جو تعلیم نبی اللہ سے حاصل کرتا ہے اس کے دل میں ایسی راسخ ہو جاتی ہے گویا وہ علوم اسی کے دل سے نکلے تھے۔

صدیق پر انوار وحی نبوت کا انعکاس ہوتا ہے اور تعاقب درود انوار سے۔

تاثیر وتاثر، فعل وانفعال کا ایسا تسلسل قائم ہو جاتا ہے کہ صدیق فنا وفدا کے منصب پر ممتاز ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت یہ کیفیت ہوتی ہے کہ نبی کی روحانیت صدیق کی زبان پر تکلم کیا کرتی ہے۔

صدیقیت کے انہی احوال پر اُن احادیث میں اشارہ ہے جو سیدنا ابو بکر صدیقؓ کی شان میں ہیں۔ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا مصاحبت اور زر و مال کی فدیہ میں ابو بکرؓ کا احسان و منت محمدؐ پر سب سے بڑھ کر ہے۔دوسری حدیث میں لو کنت اتخذت خلیلاً لاتخذت ابا بکر خلیلا ولکن اللّٰہ اتخذنی خلیلاً ۔یعنی اگر میں مخلوق میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکر کو بناتا۔مگر مجھے تو اللہ نے اپنا خلیل بنالیا۔

صدیق امت بالاتفاق ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔آپ کے سوا اور کوئی اس لقب سے ملقب نہیں ہوا۔

قرآن مجید میں ان ہی کو ثانی اثنین فرمایا گیا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام میں کسی دوسرے کو ثانی رسول نہیں بتایا گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو بکرؓ کو ہی سب سے پہلے حج اسلام کا سردار ''امیر الحج'' بنایا۔نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو بکرؓ ہی کو سب سے آخری غزوہ تبوک میں سب سے بڑی فوج کا سپہ سالار بنایا۔

نبیؐ نے اپنی موجودگی میں حضرت ابو بکرؓ کو امام بنایا اور صحابہ میں صرف وہی ہیں جو خلیفہ رسول اللہ کے خطاب سے مخاطب ہوئے۔دیگر خلفائے راشدین ''امیر المومنین'' کے لقب سے مخاطب کئے جاتے تھے۔ان سب واقعات کی وجہ یہی ہے کہ ابو بکرؓ ''صدیق'' تھے اور صدیق ہی نبی اللہ سے قریب تر ہوتا ہے۔(۳۴)

آپ کو یہ لقب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق میں سبقت پر ملا۔حضرت علیؓ تو حلفاً فرماتے کہ ابو بکر کا نام ''صدیق'' اللہ تعالیٰ نے آسمانوں سے نازل کیا ہے۔(۳۵) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نام معراج کی تصدیق پر عطا ہوا۔(۳۶)

عتیق: حضرت ابو بکرؓ کے حسن و جمال یا نیکی و خیرات میں سبقت کی بنا پر کہا جاتا ہے۔(۳۷)

امیر الشاکرین: حضرت ابو بکرؓ کے اس لقب کا ذکر علامہ عینی نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ عزیمت اور قربانیوں کی ایک داستان رقم کر کے حضرت ابو بکرؓ نے عملاً جس شکر و امتنان کا مظاہرہ کیا ہے۔اس کی بنا پر آپ کو امیر الشاکرین کہا جاتا ہے۔(۳۸) محمد الصلابی نے الصاحب، الاتقی، اور الاواہ

بھی آپ کے لقب ذکر کیے ہیں۔(۳۹)

فاروق: حضرت عمرؓ کے مزاج میں شدت وجلال تھا جس کی وجہ سے شروع اسلام میں آپ نے مسلمانوں کی شدید مخالفت کی۔آپ کے قبول اسلام سے حق وباطل میں فرق واضح ہوگیا۔ لانه فرق باسلامه الحق والباطل ۔(۴۰)

مسلمان مشکل اور پریشان کن حالات سے نکل آئے وکان اسلامه فتحا على المسلمين وفرجالهم من الضيق ۔(۴۱) اس وجہ سے آپ کو فاروق کہا جاتا ہے لیکن یہ لقب آپ کو کس نے کب عطا کیا اس بارہ میں کوئی صحیح روایت نہیں مل سکی۔ وأما لقبه فهو الفاروق باتفاق،فقيل اول من لقبه به النبی صلی الله ...... وقيل اهل الكتاب ...... وقيل جبرئيل ۔(۴۲)

محدث: حضرت عمر کے بارہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لقد كان فيما قبلكم من الامم محدثون فان يك فی امتی احد فانه عمر ۔(۴۳) کہ سابقہ امتوں میں محدث ہوتے تھے اگر میری امت میں کوئی اس مقام پر فائز ہوتو وہ عمر ہیں۔لفظ محدث کی وضاحت شارحین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق کی ہے۔(۴۴)

علامہ ابن المالکی کی رائے میں محدث وہ ہے جس کے دل میں ملاء اعلیٰ سے القاء ہو والمحدث فی الحقيقة انما هومن القی فی قلب شی من الملأ الأعلی ۔گویا محدث کا دل اخبار غیب کا محل ہوتا ہے اور یہ درحقیقت صافی قلب کے حامل لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکریم ہے۔ان کی اسی فراست کا تذکرہ حدیث میں ہے:

اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنورالله ۔

ابن العربی کے بقول ایسے دلوں کے مقابل لوح محفوظ آجاتی ہے پھر اس مقام کے حامل لوگ ایسی آوازیں سنتے ہیں جن کو دوسرے نہیں سن سکتے اور ایسی چیزیں دیکھتے ہیں جن سے دوسرے آگاہ نہیں ہوتے۔حضرت ساریہ عراق میں تھے اور حضرت عمر مدینہ میں لیکن حضرت ساریہ نے طویل فاصلہ کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ کی آواز کو سنا۔(۴۵)

امیر المومنین: تاریخ اسلام میں سب سے پہلے امیر المومنین حضرت عمرؓ ہی کو کہا گیا۔شفاء

بنت عبداللہ کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ لبید بن ربیعہ اور عدی بن حاتم مدینہ منورہ آئے ان کی ملاقات حضرت عمرو بن العاص سے ہوئی۔ انہوں نے حضرت عمرو سے کہا کہ امیر المومنین سے ہماری ملاقات کی اجازت لے دیں۔ عمرو بن العاص حضرت عمر کے پاس آئے تو کہا السلام علیك یا امیر المؤمنین ۔ حضرت عمر نے کہا یہ کیا، تو عمرو بن العاص نے کہا: انت الامیر ونحن المؤمنون کہ آپ امیر ہیں اور ہم مؤمن۔ اس کے بعد امیر المومنین کے لقب کا استعمال شروع ہوا۔(۴۶)

ذوالنورین: حضرت عثمان بن عفان اس لقب سے مشہور ہوئے۔(۴۷) آپ کو ذوالنورین کہنے کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ آپ کے عقد میں نبی کریمؐ کی دو صاحبزادیاں، رقیہ اور ام کلثوم آئیں۔(۴۸)

ابوتراب: نبی کریمؐ کے عم زاد بھائی اور داماد سیدنا علی المرتضیٰؓ کے فضائل سب سے زیادہ بیان ہوئے۔ من کنت مولاہ فعلی مولاہ حضرت علیؓ ہی کے لئے فرمایا گیا۔ نبی کریمؐ نے آپ کو ابوتراب کے نام سے پکارا اور یہ نام آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھا۔

صحیح مسلم میں اس لقب کا پس منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے ایک دن رسول اللہؐ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے اور علی کو موجود نہ پایا تو پوچھا۔ این ابن عمك کہ تمہارا عم زاد کہاں ہے۔ حضرت سیدہ نے عرض کی میرے اور ان کے درمیان کوئی شکر رنجی ہوگئی جس سے ناراض ہو کر وہ گھر سے چلے گئے اور میرے پاس قیلولہ نہیں کیا۔ رسول اللہؐ نے کسی شخص سے کہا جاؤ دیکھو وہ کہاں ہیں۔ اس شخص نے آکر اطلاع دی کہ وہ مسجد میں سوئے ہوئے ہیں۔ حضورؐ حضرت علیؓ کے پاس گئے وہ لیٹے ہوئے تھے اور ایک جانب سے ان کی چادر ڈھلکی ہوئی تھی اور ان پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ رسول اللہ اپنے ہاتھوں سے وہ مٹی جھاڑ رہے تھے اور فرما رہے تھے قم ابا التراب قم ابا التراب۔(۴۹) ابن اسحاق کے حوالے سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے:

> ابن اسحاق : حدثنی بعض اهل العلم أن علیا کان اذا غضب علی فاطمة فی شئی لم یکلمها بل کان یأخذ ترابا فیضعه علی رأسه، وکان النبی ﷺ اذا رأی ذلك عرف فیقول

مالك يا ابا تراب ۔(۵۰)

سیرت حلبیہ میں ہے کہ غزوہ ذوعشیرہ میں آپ کو خاک میں اٹے ہوئے دیکھ کر آپؐ نے ''یا ابا تراب'' ارشاد فرمایا۔(۵۱)

امین الامت: حضرت ابوعبیدہ بن جراح اجلہ صحابہ میں سے ہیں۔ نبی کریمؐ نے آپ کو امین الامت کا لقب عطا فرمایا۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ یمن سے کچھ لوگ رسول اللہؐ کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے ہمارے ساتھ ایک ایسا شخص بھیجئے جو ہم کو اسلام اور سنت کی تعلیم دے، حضرت انس کہتے ہیں کہ آپؐ نے حضرت ابوعبیدہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: هذا امين هذه الامة ۔ یہ اس امت کے امین ہیں۔(۵۲)

ایک روایت میں ہے امیناً حق امین یعنی وہ شخص بھیجوں گا جو امین ہے اور یقیناً امین ہے۔ یعنی امیناً مستحقا لان يقال له امين ۔(۵۳)

حضرت ابوعبیدہ کے لئے یہ یقیناً بہت بڑا اعزاز تھا اسی لئے جب آپ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تو لوگ دیکھنے لگے کہ یہ اعزاز کس کو ملتا ہے کیونکہ یہ اعزاز نجران کی ولایت سے بڑا ہے۔

اسی لئے حضرت عمر نے فرمایا تھا: ما احببت الامارة قط الامرة واحدة فذكر القصة کہ میں نے صرف ایک مرتبہ خواہش کی کہ مجھے امارت ملے اور پھر حضرت ابوعبیدۃ کا قصہ بیان کیا۔ یہاں ولایت وامارت کی رغبت نہیں بلکہ صفت مذکورہ کا حصول اصل مقصد تھا۔(۵۴)

امام ابی لکھتے ہیں کہ امین وہ شخص ہوتا ہے جس کی حفاظت ونگرانی میں کوئی چیز دی جائے اور وہ حفاظت کا حق ادا کرے۔ الامانة ضد الخيانة وهي قوة الرجل على القيام بحفظ ماوكل الى حفظة ۔ (۵۵)

حضرت عمرؓ رعیت کی خبر گیری کے لئے شام گئے تو حضرت ابوعبیدہ کے مکان پر بھی گئے وہاں تلوار اور سواری کے جانور کے علاوہ سامان دنیا میں سے کچھ نہ تھا یہ دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا: صدق رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم انت امين هذه الامة کہ آقا کریم نے سچ فرمایا تھا کہ آپ اس امت کے امین ہیں۔(۵۶)

حواری رسول: حضرت زبیر بن عوام کا لقب ہے جو خود رسول اللہؐ نے عطا فرمایا۔ حضرت

جابر سے روایت ہے: ان لکل نبی حواریا وان حواری الزبیر ۔(۵۷) ہر نبی کے حواری ہوتے ہیں اور میرا حواری زبیر بن عوام ہے۔حواری کے معنی ناصر و مددگار کے ہیں (۵۸)۔

ہر صحابی نبی کریم کا مخلص معاون و مددگار تھا تو پھر حضرت زبیر کی کیا تخصیص؟ علامہ عینی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میرے پاس مشرکوں کی کون جاسوسی کرے گا۔حضرت زبیر نے عرض کی کہ میں حاضر ہوں، آپ نے تین بار استفسار فرمایا تو تینوں بار آپ نے جواب دیا کہ دشمن سے میں آپ کو باخبر کروں گا۔یہ یقینی بات ہے کہ ایسے وقت میں مدد کرنا دوسرے اوقات کی نسبت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ ولاشك انه فی ذلك الوقت نصر نصرة زائدة علی غیره ۔(۵۹)

ساقی الحرمین: عہد فاروقی میں سخت قحط سالی کا دور آیا، بارش کو لوگ ترس گئے۔حضرت عمر نے اس وقت یہ دعا کی:

انا کنا نتوسل الیك بنبینا فتسقینا وانانتوسل الیك بعم نبینا فاسقنا ۔ (۶۰)	اے اللہ! ہم تیرے پاس اپنے پیغمبر کا وسیلہ لایا کرتے تھے اور تو ہم کو سیراب کر دیتا تھا، اب ہم تیری جناب میں اپنے پیغمبر کے چچا کا وسیلہ لے کر آئے ہیں ہم پر پانی برسا۔

حضرت عباس نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔(۶۱) اللہ تعالیٰ نے خوب مینہ برسایا۔لوگ حضرت عباس کے پاس گئے اور کہا:

هنیأ لك ساقی الحرمین ۔(۶۲) مبارک ہو! اے ساقی حرمین۔

سید الشہداء: یہ لقب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کا ہے۔ابن عباس سے روایت ہے :

سید الشهداء حمزة بن عبد المطلب و رجل قام الی امام جائر فأمره و نهاه فقتله ۔(۶۳)

حضرت حمزہ سید الشہداء ہیں اور جو بھی ظالم و جابر حکمران کے سامنے ڈٹ جائے اسے منکرات سے روکتے ہوئے شہید ہو جائے وہ بھی سید الشہداء ہے۔حضرت حمزہ عہد رسالت مآب

میں جس ظلم وستم سے شہید کئے گئے وہ یقیناً اس لقب کے مستحق ہیں۔

اسد اللہ واسد رسولہ: یہ بھی حضرت حمزہ کا لقب ہے۔ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ کے سامنے لڑتے ہوئے خود حضرت حمزہ نے فرمایا: انا اسد اللّٰہ واسدرسولہ ۔(۶۴) کہ میں اللہ اور اس کے رسول کا شیر ہوں۔

دوسری روایت میں ہے کہ جبرئیل نے حاضر ہوکر کہا:

ان حمزۃ مکتوب فی السماء اسد اللّٰہ واسدرسولہ ۔(۶۵) کہ آسمانوں میں حمزہ کو " اسد اللّٰہ واسد رسولہ" لکھا گیا ہے۔

امام عسقلانی آپ کے دونوں القاب کے بارہ میں لکھتے ہیں: ولقب النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسد اللّٰہ وسماہ سید الشہداء ۔(۶۶)

سید: امام حسن کے بارہ میں آقا کریم کا ارشاد گرامی ابوبکرہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: میں نے نبی کریمؐ سے منبر پر سنا اس وقت امام حسن آپ کے پہلو میں تھے۔آپ ایک بار لوگوں کو دیکھتے اور ایک بار امام حسن کی طرف، پھر فرماتے:

ابنی ھذا سید و لعل اللّٰہ ان یصلح بہ بین فئتین من المسلمین ۔ (۶۷)	میرا یہ بیٹا سید ہے اللہ تعالیٰ ان کے باعث مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرائے گا۔

ذی الجناحین: حضرت جعفر بن ابوطالب غزوہ موتہ میں شہید ہوئے۔آپ کے دونوں بازو دوران جنگ کٹ گئے تھے ان کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو پر عطا کیے۔آپؐ نے فرمایا:

مر بی جعفر اللیلۃ فی ملأ من الملائکۃ و ھو محضب الجنا حین بالدم ۔(۶۸)	آج رات جعفر فرشتوں کی جماعت کے ساتھ اڑتے ہوئے گزرے ان کے دونوں پر خون آلود تھے۔

ایک روایت میں ہے:

أن جعفر یطیر مع جبرئیل	کہ جعفر جبرئیل اور میکائیل کے ساتھ اڑ رہے

وميكائيل له جناحان عوضه الله من يريه ۔(۶۹)　　تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے دونوں بازوؤں کے بدلے دو پر عطا کردیئے۔

اسی وجہ سے حضرت جعفرؓ کو ’’طیار‘‘ بھی کہا جاتا ہے۔(۷۰)

جناحین کے بارہ میں سہیلی نے کہا ہے کہ یہ پر پرندوں کی طرح نہیں کیونکہ انسان کی صورت سب سے افضل ہے۔

فالمراد بالجناحين صفة ملكية وقوة روحانية اعطيها جعفر ۔(۷۱)　　پروں سے مراد صفت ملکیہ اورقوت روحانیہ ہے جو حضرت جعفرؓ کو عطا کی گئی۔

پروں کی کیفیت پر امام ابن حجر کا تبصرہ بہت جامع ہے چونکہ روایات سے ان پروں کی صحیح کیفیت معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کی حقیقت معلوم کرنے کے بجائے ان پر ایمان لانا چاہیے۔(۷۲)

آپ کو یہ فضیلت نبی کریمؐ کی بے مثال اطاعت اور محبت سے نصیب ہوئی۔

ابوالمساکین: مساکین سے محبت اوران کی خدمت گذاری کا جذبہ حضرت جعفرؓ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:

وكان اخير الناس للمسكين ۔(۷۳)　　کہ آپ مسکینوں کے حق میں سب سے بہتر تھے۔

آپ مسکینوں کے ساتھ محبت کرتے، ان کے ساتھ بیٹھتے اور گفتگو کرتے۔(۷۴) اسی لئے آپؐ نے حضرت جعفرؓ کو ابوالمساکین فرمایا۔(۷۵)

سیف اللہ: غزوہ موتہ میں زید بن حارثہ، عبداللہ بن رواحہ اور حضرت جعفر رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شہادت کے بعد لشکر اسلامی کی قیادت کا فریضہ حضرت خالد بن ولید بن مغیرہؓ نے انجام دیا۔ مدینہ منورہ میں خطبہ کے دوران آپؐ نے لوگوں کو تینوں قائدین کی شہادت اور حضرت خالد کے قیادت سنبھال لینے کی خبر سناتے ہوئے فرمایا: حتى اخذ سيف من سيوف الله ۔(۷۶) کہ جھنڈا اب اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے ہاتھ میں لے لیا اور اللہ تعالیٰ نے فتح عطا کی ہے۔

حضرت ابوعبیدة بن الجراح کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے ہوئے سنا:

خالد سیف من سیوف اللہ نعم فتی العشیرہ ۔ خالد اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں اوراپنے قبیلہ کے کیا ہی اچھے جوان ہیں ۔(۷۷)

ذوالشہادتین: نبی کریمؐ نے سوابن الحرث سے گھوڑا خریدا۔ بعد ازاں اس نے بیچنے سے انکار کردیا کیونکہ خرید وفروخت کے وقت کوئی گواہ موجود نہ تھا۔اس لئے سوابن الحرث کویقین تھا کہ گھوڑا اس سے نہیں لیا جائے گا۔لیکن حضرت خزیمہ نے اس بات کی شہادت دی کہ آپؐ نے یہ گھوڑا خریدا ہے۔ نبی کریمؐ نے حضرت خزیمہ بن ثابت سے پوچھا کہ تم خرید وفروخت کے معاملہ کے وقت موجود نہ تھے تو یہ گواہی کیسے دے دی۔انہوں نے عرض کی صدقتك بما جئت به وعلمت انك لا تقول الاحقا ۔میں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور جانتا ہوں کہ آپ حق کے علاوہ کچھ نہیں فرماتے۔

یہ سن کر آپ نے اس غلام کی محبت وعقیدت کی قدردانی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

من شهد له خزيمه اوشهدعليه فحسبه ۔(۷۸) جس کے لئے خزیمہ گواہی دے دیں وہ اکیلے ہی کافی ہیں۔

جعل رسول اللّٰه ﷺ له شهادة رجلين ۔(۷۹) گویا آپؐ نے اکیلے خزیمہ بن ثابت انصاری کی گواہی کو دو آدمیوں کی گواہی کے برابر کردیا۔

سفینہ: خادم رسول کا نام مہران تھا مگر ایک دفعہ صحابہ کے پاس بوجھ زیادہ تھا آپؐ نے ان کو حکم دیا کہ اپنی چادر بچھاؤ اس چادر میں بوجھ منتقل کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

احمل فما انت الاسفینة۔ اسے اٹھالو کیونکہ تم تو سفینہ ہو۔(۸۰)

صحابیات کے القاب: مردوں کے ساتھ عورتیں بھی معاشرہ کی تعمیر وترقی میں اہم خدمات انجام دیتی ہیں اس لیے وہ بھی القاب کی مستحق ہیں،طبقۂ نسواں کے اسی مقام ومرتبہ اور شرف وعزت کا خیال کرتے ہوئے نبی کریمؐ نے انہیں بھی بعض القاب سے سرفراز فرمایا،بعض کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

خیر النساء العالمین: حضرت علیؓ کی روایت ہے:

خیر نسائها خدیجة بنت خویلد و خیر نسائها مریم بنت عمران ۔ (۸۱)	عورتوں میں سب سے افضل خدیجہ بنت خویلد اور مریم بنت عمران ہیں۔

سیدۃ نساء اہل الجنۃ: نبی کریمؐ نے اپنی لخت جگر سیدہ فاطمہ کے بارہ میں ارشاد فرمایا:

فاطمة سيدة نسآء اهل الجنة ۔	نبی کریمؐ نے فرمایا فاطمہ جنت کی عورتوں کی سردار ہے۔

افقہ نساء الامۃ: حضرت سیدہ عائشہؓ کو ان کے تفقه فی الدین میں کمال مہارت کی وجہ سے یہ لقب دیا گیا۔

ذات النطاقین: اسماء بنت ابوبکر صدیق کا لقب ہے۔ ہجرت کے موقع پر جب نبی کریمؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ روانہ ہونے کا ارادہ فرمایا تو سامان سفر باندھنے کے لئے کوئی چیز دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اسماء نے اپنی قمیص کے اوپر باندھنے والے کپڑے کو پھاڑ کر دو حصے کیا اس خدمت گزاری پر انہیں ذات النطاقین کا لقب عطا ہوا۔ (۸۲)

حضرت زبیر سے یہ بھی روایت بیان کی گئی ہے:

أبدلك الله بنطاقك هذا نطاقين في الجنة ۔	اس نطاق کے بدلے اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں نطاق عطا کرے گا۔

ان القاب کے علاوہ بھی بعض صحابہ کو لقب عطا کئے گئے جیسے نقباء، اصحاب العقبۃ (۸۳)، سید اشباب اہل الجنۃ، حسنین کریمین کے لئے فرمایا گیا۔ (۸۴) ترجمان القرآن، ربانی ھذہ الامۃ، حبر الامۃ (۸۵)، خطیب الرسول (ثابت بن قیس) (۸۶)، سفینۃ (۸۷)، موذن رسول (حضرت بلال)، صاحب سر رسول (حذیفہ بن یمان) (۸۸)، ذا النور (طفیل بن عمر الدوسی) (۸۹)، غسیل الملائکہ (۹۰)۔

صحابہ اور صحابیات کے القاب کے اس تذکرہ سے امور ذیل واضح ہوتے ہیں۔

۱- کسی کی خدمت کے عوض کسی کو ایسے وصف سے یاد کرنا جس سے اس کی خدمات کا اعتراف ہو، نبی کریمؐ کا طریقہ ہے۔ عصر حاضر میں حکومت کی طرف سے دیے جانے والے

اعزازات کی اصل شاید اسی روایت کی ترقی یافتہ شکل یا تسلسل ہے۔

۲- یہ القابات خواتین کو بھی دیئے جاسکتے ہیں۔

۳- دور حاضر میں لقب نوازی کی کثرت نے بلاشبہہ اس کی قدر و قیمت اور اہمیت و افادیت کو کم کردیا ہے، اس لیے اعتراف خدمت کا وہی طریقہ موزوں و مناسب ہے جو رسول اللہؐ کا تھا، جس کی خوبی یہ تھی کہ مختصر لفظوں میں ملقب بہ شخصیت کے تمام اوصاف و کمالات جمع ہوجاتے تھے، لہذا اس سلسلہ میں اسوۂ رسول ہی قابل تقلید واتباع ہے۔

مراجع مصادر

(۱) ابن الجوزی، عبدالرحمٰن بن علی (م ۵۹۷ھ) زادالمسیر ، دارالکتب العلمیۃ بیروت ۲۰۰۲، جلد:۲، ص: ۲۰۸ ۔لغوی وضاحت کے لئے ملاحظہ فرمائیں : الجوہری ، اسمٰعیل بن حماد الصحاح ، دار العلم للملایین بیروت ۱۹۵۶ء، تحقیق احمد عبدالغفور عطار، جلد اول، ص:۲۲۱ ۔فیروزآبادی نے القاب کی تین قسمیں لکھی ہیں : لقب تشریف ، لقب تعریف ، لقب تسخیف (الفیروزآباد، مجد الدین محمد بن یعقوب، (۸۱۷ھ)، بصائر ذوی التمییز فی لطائف کتاب العزیز، المکتبۃ العلمیۃ بیروت، جلد۴، ص ۴۳۸) احمد بن علی القلقشندی نے لقب کی تعریف، اقسام اور پس منظر پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ملاحظہ فرمائے۔(القلقشندی، احمد بن علی، (۸۲۱ھ) صبح الاعشی فی صناعۃ الانشا، تحقیق نبیل خالد الخطیب، دارالکتب العلمیۃ بیروت، ۱۹۸۷ء، جلد ۵، ص۴۱۲-۴۷۳، جلد ۶، ص۱-۱۷۴) القاب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو سب سے پہلے خالق کائنات نے اپنی شاہکار تخلیق ''انسان'' کو خلیفہ کا لقب عطا فرمایا پھر مختلف انبیائے کرام کو عطا ہوئے جو قرآن میں مذکور ہیں۔(۲) العینی محمد محمود، (۸۵۵ھ) مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، جلد ۱۶، ص: ۲۳۸، فتح الباری جلد ۷، ص: ۹۳ پر بھی یہ الفاظ موجود ہیں۔(۳) الجامع لاحکام القرآن جلد ۸، ص: ۳۳۰ زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل دارالکتب العربی، بیروت، جلد ۴، ص: ۳۷۰۔(۴) آلوسی، سید محمود، روح المعانی، دارالکتب العلمیۃ بیروت، ۱۹۹۴، جلد ۱۳، ص: ۳۰۶۔(۵) القرطبی، ابوعبدمحمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، داراحیا التراث العربی بیروت، جلد ۸، ص: ۳۳۰۔(۶) مسلم بن حجاج،

الجامع الصحیح،کتاب فضائل الصحابہ، باب بیان ان بقاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امان لاصحابہ وبقاء ...... (۷) نفس مصدر۔(۸) نفس مصدر۔(۹) العسقلانی، احمد بن علی بن حجر (۸۵۲ھ)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، دار صادر بیروت ۱۳۲۸ھ جلد اول ص: ۷۔ (۱۰) ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے: السیوطی، عبدالرحمٰن بن ابوبکر (۹۱۱ھ) تدریب الراوی فی شرح تقریب النوادی، تحقیق عبدالوہاب عبداللطیف، المکتبۃ العلمیۃ، مدینہ منورہ، ۱۳۹۲، جلد ۲، ص: ۲۱۳-۲۱۴۔ صحابہ کے احوال وحیات پر متعدد کتب تحریر کی گئی ہیں۔ حدیث کی ہر کتاب میں فضائل صحابہ کے عنوان سے روایات موجود ہیں۔ معرفۃ من نزل من الصحابہ سائر البلدان = علی بن المدینی۔ معرفۃ الصحابہ = ابونعیم۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب = عمر بن عبدالبر۔ الاصابہ فی تمیز الصحابہ = ، ابن حجر۔ الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ = محب الطبری۔ السمط الثمین فی مناقب امہات المومنین = محب الطبری۔ اعلام الاصابہ باعلام الصحابۃ = عبدالواحد المقدسی۔ اسد الغابہ = ابن الاثیر۔ رجال ونساء حول الرسول = الشیخ حسن ایوب۔ درالسحابۃ فی مناقب القرابۃ والصحابۃ = شوکانی۔ روضۃ المحبین فی فضائل صحابۃ النبی الامین = شیخ مصطفیٰ عدوی۔ نساء مبشرات بالجنۃ = احمد خلیل جمعۃ۔ زوجات النبی الطاہرات وحکمۃ تعددھن = محمد محمود الصواف۔ رجال حول الرسول = خالد محمود خالد۔ رجال مع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی طریق الدعوۃ = صنعۃ احمد یوسف۔ نساء حول الرسول = محمود مھدی۔ فضائل الصحابہ = امام نسائی۔ سیرت الصحابہ = مصطفیٰ مراد۔ الخلفاء الراشدون = محمد رضا۔ ان کے علاوہ ابوبکر بن ابی داؤد، ابو علی بن السکن، ابوحفص بن شاہین، ابومنصور الباورودی، ابن حبان، ابوالعباس الدغولی، ابونعیم، عبداللہ بن مندہ، محمد بن الجارود، ابوالقاسم البغوی اور دیگر بہت سے اہل علم نے اس موضوع پر لکھا۔ اس موضوع پر اردو میں طالب الہاشمی اور معین الدین ندوی کی تالیفات معروف ہیں۔ (۱۱) مقدمہ الاستیعاب جلد اول ص: ۹۳۔ (۱۲) سعیدی غلام رسول، تبیان القرآن، فرید بک اسٹال لاہور، ۲۰۰۰ء جلد ۴، ص: ۷۰۸-۷۰۹۔ (۱۳) الکاشف عن حقائق السنن، جلد ۱۱، ص: ۳۳۲۔ (۱۴) صحیح بخاری، کتاب المناقب۔ (۱۵) الجامع الصحیح، مسلم بن حجاج، کتاب فضائل الصحابۃ باب فضائل الانصار (۱۶) محمد بن اسماعیل بخاری، الجامع الصحیح، کتاب المناقب، باب مناقب الانصار ۔ (۱۷) الطیبی محمد بن عبداللہ، ۷۴۳ھ الکاشف عن حقائق السنن، کراچی، ۱۴۱۳ھ، جلد ۱۱، ص: ۳۳۲۔ (۱۸) نفس مصدر۔ (۱۹) نفس مصدر۔

(۲۰) نفس مصدر۔ (۲۱) نفس مصدر۔ (۲۲) مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب ان حب الانصار وعلی رضی اللہ عنهم من الایمان (۲۳) مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح، کتاب فضائل الصحابہ۔ (۲۴) ابن ماجہ، محمد بن یزید القزوینی (۲۷۵ھ) سنن، تحقیق محمد فواد عبدالباقی، داراحیاء الکتب العربیۃ، ۱۹۵۲ جلد اول، ص: ۴۸، رقم الحدیث ۱۳۳۰۔ (۲۵) محدث دہلوی، عبدالحق، اشعۃ اللمعات، مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر، جلد: ۴، ص: ۶۷۱۔ (۲۶) تعداد کے بارہ میں مختلف روایات کے لئے ملاحظہ فرمایئے العسقلانی احمد بن علی بن حجر (۸۵۴ھ) فتح الباری، دارنشر الکتب الاسلامیہ لاہور ۱۹۸۱ء جلد ۷ ص: ۲۹۱-۲۹۲ (۲۷) محمد بن اسماعیل بخاری، الجامع الصحیح، کتاب المغازی، باب فضل من شهد بدرا (۲۸) فتح الباری جلد ۷، ص: ۳۰۵۔ (۲۹) نفس مصدر، ص: ۳۱۲۔ (۳۰) تعداد کے بارہ میں مختلف اقوال اوران میں تطبیق کیلئے فتح الباری جلد ۷، ص: ۴۴۰ دیکھئے۔ (۳۱) الجامع الصحیح، امام مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل اصحاب الشجرۃ......۔ (۳۲) تفصیلات مع حوالہ جات کے لئے راقم کی کتاب ''سماجی بہبود تعلیمات نبوی کی روشنی میں'' ناشر مکتبہ جمال کرم لاہور ۲۰۰۵ء ص: ۳۲ ملاحظہ فرمائیں۔ (۳۳) الحاکم، مستدرک علی الصحیحین تحقیق عبدالقادر عطا، دارالکتب العلمیۃ ۱۴۱۱ھ، جلد ۳، ص: ۷۱ رقم الحدیث ۴۲۹۱۔ (۳۴) سلمان منصور پوری، قاضی محمد سلیمان، الجمال والکمال، مکتبہ الدعوۃ الاسلامیہ پاکستان ۱۹۶۲ء ص: ۱۵۰-۱۵۱۔ (۳۵) فتح الباری جلد ۷، ص: ۹۔ (۳۶) العینی، ابومحمد محمود (۸۵۵ھ)، عمدۃ القاری، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ ۱۴۰۶، جلد ۱۶، ص: ۱۷۲۔ (۳۷) نفس مصدر۔ (۳۸) نفس مصدر۔ (۳۹) الصلابی، الدکتور علی محمد، ابو الصدیق، شخصیتہ وعصرہ، دارابن کثیر ۲۰۰۳، ص: ۱۷-۱۹)۔ (۴۰) السنوسی، محمد بن یوسف، ۸۹۵ھ، دارالکتب العلمیۃ بیروت، جلد ۱، ص: ۱۹۹۔ (۴۱) الاصابۃ جلد ۲، ص: ۵۱۸۔ (۴۲) فتح الباری جلد ۷، ص: ۴۴، عمدۃ القاری جلد ۱۶، ص: ۱۹۲۔ (۴۳) محمد بن اسماعیل بخاری، الجامع الصحیح، کتاب المناقب، باب مناقب عمر بن الخطاب......۔ (۴۴) فتح الباری جلد ۷، ص: ۵۰، الکاشف عن الحقائق السنن جلد ۲، ص: ۲۲۹، مبارکپوری، عبدالرحمٰن، ۱۳۵۲ھ، تحفۃ الاحوذی، نشر السنۃ ملتان، جلد ۴، ص: ۳۱۷۔ (۴۵) علامہ ابی، ابوعبداللہ محمد بن خلفہ (۸۲۷ھ) اکمال اکمال المعلم، دارالکتب العلمیۃ بیروت، جلد ۹، ص: ۲۰۴ ملخص۔ (۴۶) الھیثمی، نورالدین علی بن ابوبکر (۸۰۷ھ)، مجمع الزوائد، مؤسسۃ المعارف بیروت ۱۹۸۶ء جلد ۹ ص: ۶۴۔ (۴۷) فتح الباری جلد ۷، ص: ۵۴۔ (۴۸)

اکمال اکمال المعلم جلد ۶، ص: ۲۰۶؍۱۲ الاصابہ جلد ۲ ص: ۴۶۲۔ (۴۹) الجامع صحیح، امام مسلم، کتاب فضائل الصحابہ۔ (۵۰) ۵۸۸/۱۰ فتح الباری۔ (۵۱) سیرت حلبیہ جلد ۲، ص: ۱۴۲۔ (۵۲) امام مسلم، الجامع الصحیح، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل ابی عبیدۃ بن الجراح۔ (۵۳) تحفۃ الاحوذی جلد ۴، ص: ۳۳۶۔ (۵۴) فتح الباری جلد ۷، ص: ۹۴؍ عمدۃ القاری جلد ۱۶، ص: ۲۳۹۔ (۵۵) اکمال اکمال المعلم جلد ۶، ص: ۲۴۵۔ (۵۶) نفس مصدر ص: ۲۴۶۔ (۵۷) امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب المناقب۔ (۵۸) سنن الترمذی، ابواب المناقب، مناقب الزبیر۔ (۵۹) عمدۃ القاری جلد ۱۶، ص: ۲۲۳۔ (۶۰) محمد بن اسماعیل بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الصلوٰۃ، ابواب الاستسقاء۔ (۶۱) آپ کی دعاء الاستعیاب میں مختلف روایات کو اکٹھا کر کے لکھی گئی ہے۔ (جلد ۲، ص: ۳۶۰)۔ (۶۲) القرطبی، محمد بن عبد البر، (۴۶۳ھ) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، تحقیق الشیخ علی محمد معوض، دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۱۵ھ جلد ۲، ص: ۳۶۱)۔ (۶۳) مجمع الزوائد جلد ۹، ص: ۲۷۱۔ (۶۴) مجمع الزوائد جلد ۹، ص: ۲۷۱۔ (۶۵) فتح الباری جلد ۷، ص: ۳۷۱۔ (۶۶) الاصابہ جلد اول ص: ۳۵۴۔ (۶۷) الجامع الصحیح، کتاب المناقب، باب مناقب، الحسن والحسین۔ (۶۸) فتح الباری جلد ۷، ص: ۷۶ (۶۹) نفس مصدر۔ (۷۰) الکاشف عن حقائق السنن جلد ۱۱، ص: ۲۹۱۔ (۷۱) فتح الباری جلد ۷، ص: ۵۱۵۔ (۷۲) فتح الباری جلد ۷، ص: ۵۱۶ (۷۳) امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب المناقب۔ (۷۴) الاصابہ جلد اول ص: ۲۳۷۔ (۷۵) نفس مصدر ر سنن ترمذی، ابواب المناقب۔ (۷۶) امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب المناقب۔ (۷۷) ابن الجوزی، ابو الفرج، (۵۹۷ھ) صفۃ الصفوۃ، تحقیق محمود فاخوری، دار المعرفۃ بیروت، ۱۹۸۶، ص: ۶۵۳۔ (۷۸) مجمع الزوائد جلد ۹، ص: ۳۲۳۔ (۷۹) نفس مصدر ر صفۃ الصفوۃ جلد اول، ص: ۲۰۲-۲۰۳۔ (۸۰) صفۃ الصفوۃ جلد اول ص: ۶۷۱۔ (۸۱) الجامع الصحیح، امام مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ ر سنن الترمذی۔ (۸۲)۔ الجامع الصحیح، محمد بن اسماعیل بخاری، باب الهجرۃ۔ (۸۳) صحیح بخاری، ابواب الهجرۃ۔ (۸۴) مجمع الزوائد جلد ۹، ص: ۱۸۵۔ (۸۵) الاستیعاب جلد ۳، ص: ۶۷۔ (۸۶) صفۃ الصفوۃ جلد اول ص: ۶۲۶۔ (۸۷) صفۃ الصفوۃ جلد اول ص: ۶۷۱۔ (۸۸) الاستیعاب جلد اول ص: ۳۹۴۔ (۸۹) الاستیعاب جلد ۲، ص: ۳۱۲۔ (۹۰) الاستیعاب جلد اول ص: ۴۲۳۔

موازنہ انیس و دبیر: ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

موازنہ انیس و دبیر نہ صرف علامہ شبلی بلکہ اردو کی مقبول ترین کتاب ہے، طبع اول ۱۹۰۷ء سے لے کر آج تک اہل علم اور ارباب نظر کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے، متعدد نقادوں نے اس کی عظمت و اہمیت کا اعتراف کیا ہے، اس کے مطالعہ و تجزیے پر مشتمل سینکڑوں مضامین اور کم از کم تین مقالات لکھے جاچکے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ موازنہ انیس و دبیر ہماری ادبی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

علامہ شبلی علی گڑھ کے بعد سرکار آصفیہ حیدرآباد کے سررشتہ علوم وفنون سے وابستہ ہوئے تو یہاں کے ادبی ماحول میں انہیں خیال آیا کہ اردو کے کسی ایسے شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے جس سے اردو شعروادب کی کم مائیگی کا احساس ختم ہو، چنانچہ انہوں نے میر و غالب کے مقابلہ میں میر انیس کا انتخاب کیا، ان کا خیال تھا کہ کلام انیس میں محاسن شعری بدرجہ اتم موجود ہیں۔(۱)

۱۹۰۳ء میں موازنہ لکھنے کا آغاز ہوا اور ۱۹۰۴ء میں یہ کتاب پایہ تکمیل کو پہنچی اور اشاعت کی غرض سے سرکار عالیہ حیدرآباد میں پیش ہوئی، مگر علامہ شبلی کی تمام کوششوں کے باوجود وہاں اشاعت کی نوبت نہ آسکی اور نہ ہی اس کا مسودہ واپس ملا اب وہ مسودہ نیشنل آرکائیوز دہلی کی تحویل میں ہے، مسودہ کی عدم دستیابی کے بعد علامہ شبلی نے اسے لکھنؤ میں دوبارہ لکھا اور ۱۹۰۷ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے منشی قادر علی خاں صوفی کے زیر اہتمام طبع کرایا، اس وقت سے یہ مسلسل شائع ہو رہی ہے، اب تک اس کے مندرجہ ذیل ایڈیشن چھپ چکے ہیں:

۱-۱۹۲۴ء الناظر۔ ۲-۱۹۳۱ء شیخ جان محمد، لاہور۔

رفیق اعزازی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ۔

۳-۱۹۳۶ء رام نرائن لال، الٰہ آباد۔ ۴-۱۹۶۱ء رام نرائن لال، الٰہ آباد۔
۵-۱۹۶۲ء اردو اکیڈمی، کراچی۔ ۶-۱۹۶۴ء مجلس ترقی ادب، لاہور۔
۷-۱۹۶۵ء مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۸-۱۹۶۹ء مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔
۹-۱۹۷۷ء رام نرائن ارون کمار، الٰہ آباد۔ ۱۰-۱۹۸۱ء ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔
۱۱-۱۹۸۲ء مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔ ۱۲-۱۹۸۶ء اردو اکادمی، لکھنؤ۔
۱۳-۱۹۸۸ء ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ ۱۴-ب۔ت لاہور پرنٹنگ ورکس، لاہور۔
۱۵-ب۔ت چمن بک ڈپو، دہلی۔ ۱۶-۲۰۰۴ء دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ۔

یہ موازنہ انیس و دبیر کی معلوم اشاعتیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس کے نہ جانے کتنے ایڈیشن پبلشرز نے شائع کیے، چونکہ یہ کتاب کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہی اس لیے متعدد پبلشرز نے طلبہ کی سہولت کے پیش نظر سستے ایڈیشن شائع کیے جس کی تفصیلات دستیاب نہ ہوسکیں۔

اردو کے ممتاز نقادوں نے موازنہ کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اس کی تصحیح وتحقیق اور مراجعت کی اور محقق ایڈیشن شائع کرنے کا اہتمام کیا، اس طرح اس کے مندرجہ ذیل ایڈیشن شائع ہوئے:

۱- سید عابد علی عابد مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء۔
۲- رشید حسن خاں مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء۔
۳- ڈاکٹر مسیح الزماں رام نرائن لال بینی مادھو، الٰہ آباد۔
۴- ڈاکٹر فضل امام ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۱ء۔
۵- ڈاکٹر سید رفیق حسین رام نرائن ارون کمار، الٰہ آباد، ۱۹۷۷ء۔
۶- محمد الیاس الاعظمی دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، ۲۰۰۴ء۔

موازنہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ارباب نظر نے اس کو تحقیق وتنقید کا موضوع قرار دیا اور اس پر تحقیقی مقالے لکھوائے، پہلا مقالہ ڈاکٹر ارشاد نیازی کا ہے، جو ''موازنہ انیس و دبیر، مطالعہ، محاسبہ، تقابل'' کے عنوان سے دہلی سے ۲۰۰۰ء میں چھپ چکا

ہے، ۱۹۵۵ء میں ایک اور مقالہ برائے ایم فل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو میں ''موازنہ انیس و دبیر کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے سہیل اختر نے لکھا جواب تک شائع نہیں ہوسکا ہے، اس کے علاوہ ایک اور کتاب سید ظہور الاسلام نے ''موازنہ انیس و دبیر کا تنقیدی مطالعہ'' کے نام سے لکھی ہے جو راقم کی نظر سے نہیں گذری ہے۔

ان مستقل مطالعات کے علاوہ موازنہ کی اشاعت کے بعد انیس و دبیر پر جس قدر تحریریں وجود میں آئیں ان میں شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہو جس میں شبلی اور موازنہ کا ذکر نہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ شبلی نے ایک موازنہ لکھ کر سینکڑوں موازنے لکھوا دیے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موازنہ ایک صدی سے ہمارے نقادوں کے دل و دماغ اور ذوق و وجدان پر کس قدر اثر انداز ہوئی اور اس کے کس قدر دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔

موازنہ کا آغاز ایک مختصر تمہید سے ہوا ہے جس میں وجہ تالیف، میر انیس کے انتخاب کا سبب، شاعری کی حقیقت اور مراثی میں جن لوگوں کا ذکر آتا ہے ان کے نام اور خصوصیات کا مختصراً ذکر ہے، مولانا شبلی قوم کی بدمذاقی پر اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فلسفہ اور شاعری برابر درجے کی چیزیں ہیں لیکن قوم کی بدمذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کرلیا ہے اس نے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اردو شاعری میں زلف و خال و خط یا جھوٹی خوشامد اور مداحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، میر تقی کی غزلیت، درد کا تصوف، غالب کا فلسفہ، شاعری کی جان ہیں لیکن ان بیش بہا خزانوں میں سے بھی عام لوگوں کی نگاہ صرف خزف ریزوں پر پڑتی ہے، میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے لیکن ان کی قدردانی کا طغرائے امتیاز صرف اس قدر ہے کہ ''کلام فصیح ہوتا ہے اور بین اچھا لکھتے ہیں''۔ بدمذاقی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اور مرزا دبیر حریف مقابل قرار دیے گئے اور مدت ہائے دراز کی غور و فکر، کد و کاوش، بحث و تکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ ہوسکا کہ مسند نشیں کس کو کیا جائے''۔(۲)

اس بدمذاقی نے ان کے دل میں یہ داعیہ پیدا کیا کہ میر انیس کی عظمت اور ان کے محاسن

کو اجاگر کیا جائے تاکہ اس بدمذاقی کا سدباب ہو سکے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ وتنقید لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مایگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے؟ اس غرض کے لیے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا تھا کیوں کہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے"۔ (۳)

سبب تالیف اور انتخاب انیس کے وجوہ بیان کرنے کے بعد شاعری کی حقیقت و ماہیت بیان کی ہے اور ان اصولوں کا ذکر کیا ہے جس کی روشنی میں کلام انیس کا مطالعہ وتجزیہ ناگزیر ہے، وہ لکھتے ہیں:

"شاعری کے دو جز ہیں، مادہ وصورت، یعنی کیا کہنا چاہیے اور کیوں کر کہنا چاہیے؟ انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی حالت یا واقعے کے پیش آنے سے جوش ومسرت، عشق ومحبت، درد ورنج، فخر وناز، حیرت و استعجاب، طیش وغضب وغیرہ وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے، اس کو جذبات سے تعبیر کرتے ہیں، ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصل ہیولیٰ ہے، ان کے سوا عالم قدرت کے مناظر مثلاً گرمی وسردی، صبح وشام، بہار وخزاں، باغ و بہار، دشت وصحرا، کوہ وبیاباں کی تصویر کھینچنا یا عام واقعات اور حالات کا بیان کرنا بھی اس میں داخل ہے۔

لیکن یہ شرط ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے، شاعری کا دوسرا جز یعنی اس کی صورت ہے اور ان ہی دونوں جزوں کے مجموعے کا نام شاعری ہے، باقی خیال بندی، مضمون آفرینی، دقت پسندی، مبالغہ، صنائع وبدائع شاعری کی حقیقت میں داخل نہیں، اگرچہ بعض جگہ یہ چیزیں نقش ونگار اور زیب وزینت کا کام دیتی ہیں، میر انیس کی شاعری کو اسی معیار سے جانچنا چاہیے، جس کا مختصراً بیان ہوا جس

شخص کو یہ معیار تسلیم نہ ہو اس کے سامنے میر انیس کی نسبت کمال شاعری کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا''۔(۴)

طویل اقتباس اس لیے نقل کیا گیا کہ شبلی کا تصور شعروشاعری کیا تھا اور انہوں نے کلام انیس کو کن اصول ونظریات کی روشنی میں پرکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ کلام انیس میں اصناف سخن کے بہتر سے بہتر نمونے پائے جاتے ہیں اور ان کا کلام مرزا دبیر سے بلند رتبہ ہے پورے طور پر واضح ہو جائے۔

تمہید کے بعد مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ ہے جس میں قصائد پر مرثیے کا اثر، قدیم عربی و فارسی مرثیہ نگاری، اردو مرثیہ نگاری کا آغاز وارتقاء اور انیس سے پہلے کے مرثیہ نگاروں کی کاوشوں کا ذکر ہے، کتاب کا یہ حصہ اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار لکھا گیا، اس سے قبل مولوی محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' اور مولانا حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں انیس اور مرثیے کا ذکر اجمالی طور پر کیا تھا شبلی نے مرثیے کے آغاز وارتقاء کی تاریخ کا تصور پیش کر کے نہ صرف انیس و دبیر بلکہ اصناف ادب میں مرثیے کو بلند مقام عطا کیا، بعض نقادوں نے اس میں تحقیق و تدقیق کی کمیاں نکالی ہیں اور شبلی پر تلاش و تفحص سے کام نہ لینے کا الزام عائد کیا ہے (۵)۔ حالانکہ معاملہ محض اس قدر ہے کہ یہ تحریر پس منظر کے طور پر قلم بند کی گئی ہے، اس سے ایک مفصل تاریخ کا مطالبہ و مواخذہ کرنا شبلی کے ساتھ انصاف نہیں، تاہم اس کو بنیاد بنا کر بعد کے اہل قلم نے مرثیہ کی جو تاریخیں لکھیں وہ دراصل شبلی کی اسی تحریر کے نتائج ہیں۔

پس منظر کے بعد میر انیس کے حالات اور خاندانی احوال کا مختصراً ذکر ہے، سید احتشام حسین کا خیال ہے کہ شبلی نے میر انیس کے احوال بھی سرسری لکھے جب کہ معمولی تلاش و تفحص سے ان کے مفصل حالات لکھے جاسکتے تھے (۶)۔ یہ اعتراض اپنی نوعیت کے لحاظ سے درست معلوم ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا شبلی انیس کے حالات لکھنا چاہتے تھے اور انہوں نے حق ادا نہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ انیس کے حالات و سوانح لکھنا مصنف کے پیش نظر تھا ہی نہیں بلکہ انیس کے شاعرانہ کمالات کا ذکر مقصود تھا اس لیے انہوں نے کتاب کے ضمنی مباحث پر زور صرف نہیں کیا ورنہ الفاروق کے مصنف کو جس نے الفاروق کے لیے روم و مصر و شام کا سفر کر ڈالا ہو

انیس کے حالات دریافت کرنا کیا مشکل تھا۔

اس کے بعد علامہ شبلی نے انیس کے شاعرانہ کمالات اور فنی خصوصیات کا مفصل جائزہ لیا ہے اور دکھلایا ہے کہ انیس ایک مایہ ناز شاعر تھے اور ان کا کلام اردو شاعری کا سرمایہ ناز ہے۔ شاعری کے بنیادی ارکان ولوازمات مثلاً فصاحت و بلاغت، روزمرہ اور محاورے، ضرب الامثال، بحر، حسن قافیہ وردیف، تنسیق الصفات، تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع، حسن التعلیل، لف ونشر، مراعات النظیر، منظر نگاری، واقعہ نگاری، رزمیہ، جذبات کی عکاسی وغیرہ پر میر انیس کس قدر مہارت رکھتے تھے اور فن کی باریکیوں، نزاکتوں اور رفعتوں پر ان کی کس قدر گہری نگاہ تھی، ان تمام بنیادی مباحث کا علامہ شبلی نے تنقیدی تجزیہ کیا ہے، مثالیں دی ہیں اور انیس کی عظمت بیان کی ہے، مثلاً فصاحت کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> ''میر انیس صاحب کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈ کر لاتے ہیں، مرزا دبیر اور میر انیس کے ہم مضمون اشعار لو اگر مرزا صاحب کے ہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے تو ان کے مقابلے میں میر صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے اور اگر مرزا صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے تو میر صاحب کے ہاں فصیح تر ہوں گے، مرزا دبیر کی تخصیص نہیں تمام مرثیہ گویوں کے مقابلے میں میر انیس کے کلام کا یہی حال ہے''۔(۷)

انسانی جذبات واحساسات کو شاعری کی روح قرار دیتے ہوئے شبلی نے میر انیس کی جذبات نگاری کا جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''میر انیس کا اصلی جوہر یہیں آکر کھلتا ہے اور یہیں ان کی شاعری کی حد ان کے ہم عصروں سے بالکل جدا ہو جاتی ہے، انسانی جذبات کی سینکڑوں قسمیں ہیں اور پھر ہر ایک کے مختلف مراتب اور مدارج ہیں مثلاً جذبات انسانی کی ایک قسم محبت ہے لیکن محبت کے بھی مختلف اقسام اور مدارج ہیں، باپ بیٹے کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، یار آشنا کی محبت، آقا اور غلام کی محبت، وغیرہ وغیرہ، میر انیس کے مرثیوں میں نہایت کثرت سے ان جذبات اور ان کے مختلف مدارج کا

ذکیے لیکن جس جگہ جس چیز کولیا ہے اس کمال کے ساتھ اس کی تصویر کھینچی ہے کہ
اس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے''۔(۸)

اسی طرح میر انیس کی واقعہ نگاری کے متعلق لکھا ہے کہ:

''میر انیس نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجے تک پہنچایا ہے
اردو کیا فارسی میں بھی اس کی نظیریں مشکل سے مل سکتی ہیں''۔(۹)

اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی،
چستی کے ساتھ بے تکلفی، دل آویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور
استعارات، اصول بلاغت کے مراعات، ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز
مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے، فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بندش میں
تعقید اور اغلاق تشبیہات و استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز
یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں، خیال آفرینی اور
مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے''۔(۱۰)

علامہ شبلی نے اپنے موقف کی تائید میں مراثی انیس سے کثرت سے اشعار نقل کیے ہیں اور جہاں جہاں دبیر سے موازنہ کیا ہے وہاں دبیر کے مراثی سے بھی استدلال کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ میر انیس کا کلام مرزا دبیر سے بلند رتبہ ہے، خاص طور سے فنی لحاظ سے دبیر کا کلام انیس سے فروتر ہے۔

اس کے بعد میر انیس کی رباعی اور سلام نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے، کلام انیس پر نساخ نے جو اعتراضات کیے ہیں ان کا بھی ذکر ہے، خود بھی چند اعتراضات وارد کیے ہیں، پھر سرقات کے عنوان سے ان موضوعات کی نشان دہی کی ہے جو انیس کے پیش رو مرثیہ نگاروں نے باندھے تھے اور جنہیں انیس نے بھی باندھا ہے، آخر میں انیس و دبیر کے متحد المضمون اشعار نقل کر کے ایک دوسرے سے تجزیہ و مقابلہ کیا گیا ہے، شبلی نے یہاں بھی انیس کی برتری ثابت کی ہے البتہ کہیں کہیں جہاں دبیر کے کلام میں خوبیاں تھیں ان کا بھی اعتراف کیا ہے، مجموعی طور سے ''موازنہ انیس و دبیر'' انیس کی شاعرانہ عظمت کا مرقع ہے، یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انیس کے فکر

وفن پر اس سے عمدہ کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔

چونکہ موازنہ انیس و دبیر کی اشاعت سے پہلے بلکہ عہد انیس و دبیر سے ان کے حامی باہم برسر پیکار رہتے تھے، اس لیے موازنہ کی اشاعت اور انیس کی حمایت نے ایک ہنگامہ برپا کردیا، دبیر کے حامی چراغ پا ہو گئے اور مخالفت میں مضامین اور کتابیں لکھیں، موازنہ انیس و دبیر اور خود علامہ شبلی پر طرح طرح کی تنقیدیں کی گئیں اور یہ ایک متنازعہ کتاب قرار پائی لیکن چونکہ علامہ شبلی نے اپنے خیالات مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کیے تھے اس لیے علی العموم ان کے خیالات کو تسلیم کیا گیا اور آج ایک صدی گذرنے کے بعد شبلی کے موقف کی صداقت سب پر واضح ہے اور مخالفت میں لکھی جانے والی کتابوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں، موازنہ کے جواب میں لکھی جانے والی کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱-ردالموازنہ میر افضل علی ضو مطبع تصویر عالم، لکھنؤ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۸ء۔

۲-تردید الموازنہ حسن رضا و محمد جان عروج مطبع تصویر عالم، لکھنؤ۔

۳-المیزان نظیر الحسن فوق رضوی مطبع مفید عام، علی گڑھ ۱۹۱۴ء۔

اول الذکر ردالموازنہ ستر صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مرزا دبیر پر علامہ شبلی کے اعتراضات کو درج ذیل پانچ قسموں میں تقسیم کیا ہے: ۱-ایراد معانی بے جا۔ ۲-ابتدائے عمر کا کلام۔ ۳-اتہام بر بنائے مشہور عوام۔ ۴-ملحقات۔ ۵-وہ کلام جو شبلی صاحب سے پڑھا نہیں گیا۔اور پھر ان کے تحت اعتراضات شبلی کا جواب دیا گیا ہے اور سنجیدہ لب ولہجہ کے بجائے شوخ اور غیر متین انداز میں یہ جوابات لکھے گئے ہیں، ردالموازنہ کے مصنف نے دبیر پر شبلی کے عتراضات کا جائزہ لینے کے علاوہ شبلی کی زبان و بیان اور اسلوب پر بھی تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ ”جونپور اور اعظم گڈہ اور جگہ ہے اور لکھنؤ اور مقام ہے“ گویا مصنف کو لکھنوی زبان پر ناز ہے ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شبلی لکھنؤ کی زبان سمجھنے سے قاصر رہے اور پھر یہ طنز کیا ہے:

سیکھ لو اے بلبلو یہ داستاں کچھ اور ہے لکھنؤ کے رہنے والوں کی زباں کچھ اور ہے

کم وبیش یہی حال تردید الموازنہ کا بھی ہے جو چالیس صفحات کا رسالہ ہے، اس کے بارے میں نیر مسعود نے سچ لکھا ہے کہ ”عروج نے شبلی کے اعتراضوں کے جو جواب دیے ہیں وہ

بہت اطمینان بخش نہیں ہیں۔(۱۱)

مذکورہ کتابوں کے مصنّفین میں کوئی بھی شخص شبلی کے پایہ کا ادیب و نقاد نہ تھا، اس لیے حق جواب ادا نہ کرسکا، وسعت معلومات، سائنٹفک تجزیہ اور حسن استدلال کی کمی کے ساتھ اسلوب نگارش کے لحاظ سے بھی یہ کتابیں قابل ذکر نہیں تاہم ان کی اس حیثیت سے کہ یہ موازنہ اور شبلی کی مخالفت میں سپرد قلم کی گئیں کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ البتہ مذکورہ کتابوں میں سب سے مفصل اور لائق اعتنا نظیر الحسن فوق کی کتاب ''المیزان'' ہے، اس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ دبیر کے کلام میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو انیس کے یہاں پائی جاتی ہیں اور شبلی نے جس کی نشان دہی کی ہے، اسی طرح انیس کے یہاں وہ تمام نقائص پائے جاتے ہیں جو شبلی نے دبیر کے یہاں ثابت کیے ہیں، یہ کتاب جب شائع ہوئی اور مولانا شبلی کی نظر سے گذری تو انہوں نے بھی دبیر شناسی کی داد دی اور اس کے مصنف کے نام ایک خط میں لکھا کہ:

> ''آپ نے نہایت متانت و سنجیدگی سے کتاب کا جواب لکھا ہے جو اس زمانے میں نہایت غنیمت ہے، آج مجھ کو موازنہ کی قدر ہوئی کیوں کہ اس بہانے اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ اور ایک باکمال (دبیر) کے جوہر اچھی طرح کھلے، آپ کی عنایت کا مشکور اور طرز تحریر کا مداح ہوں''۔(۱۲)

یہ علامہ کی عالی ظرفی اور تعصّبات سے پاک شخصیت کا ایک نمونہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں جابجا شبلی کی تنقیص کی گئی ہے، بعض غلط نتائج اخذ کیے گئے ہیں، تنقیدی مباحث میں بھی وسعت اور گہرائی نہیں، اسلوب نگارش کے لحاظ سے بھی یہ موازنہ سے کم رتبہ ہے۔(۱۳)

ان مستقل کتابوں کے علاوہ متعدد مضامین بھی مخالفت میں لکھے گئے ان سب میں قدرے مشترک ایک ہی ہے کہ علامہ شبلی نے دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور ان کے شاعرانہ خصوصیات کے بیان میں قصداً کوتاہی برتی، اور ان کے کلام کا اچھا انتخاب نہیں پیش کیا۔ میر انیس کا ذکر بڑھا چڑھا کر کیا، بعض دوسرے شعراء کے اشعار دبیر سے منسوب کر کے غلط نتائج اخذ کیے وغیرہ۔

معترضین نے علامہ شبلی پر مذہبی تعصب کا الزام بھی عائد کیا ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شبلی نے میر انیس کی آڑ لے کر دبیر پر تنقید کی پھر میر انیس کو بھی نہیں بخشا اور ان کو اغلاط و

سرقات کا مرتکب ٹھہرایا وغیرہ کم وبیش تینوں کتابوں میں یہی اعتراضات کیے گئے ہیں۔

ردالموازنہ اور تردید الموازنہ کے مصنّفین نے حد تنقید سے بڑھ کر شبلی کی تنقیص بھی کی ہے، شہرت کی ہوس اور ان کی برادری روتارہ کا بھی مضحکہ اڑایا ہے، لیکن ان الزامات میں واقعیت نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شبلی نے جو کچھ لکھا ہے قوی دلائل کی بنیاد پر لکھا ہے، کلام انیس و دبیر سے استدلال کیا ہے، فکری وفنی بحثیں کی ہیں اور اپنے اعلیٰ ادبی وتنقیدی شعور وبصیرت سے کام لیتے ہوئے انیس کی عظمت اور دبیر کی کم مایگی دکھلائی ہے، وہ محض اپنے ذاتی خیالات کی بنیاد پر انیس کے مداح و معترف نہیں بلکہ وہ اپنے مطالعے ومشاہدے اور اصول ونظریات کی بنیاد پر ان کے عظمت شناس ہیں، علامہ شبلی موازنہ انیس و دبیر میں غیر جانب داری کو اہمیت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہماری رائے ہے کہ جس وسعت اور تفصیل کے ساتھ میر انیس کی خوبیاں ظاہر کی گئیں ہیں اسی طرح نہایت آزادی اور بے باکی کے ساتھ ان کی ہر قسم کی فروگذاشتیں اور غلطیاں بھی ظاہر کی جائیں“۔(۱۴)

ان کا یہ بھی خیال تھا کہ:

”میر انیس کے کمال کا اگرچہ جس قدر مجھ کو اعتراف ہے شاید ہی کسی اور کو ہوگا تاہم میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ان کا کلام فروگذاشتوں اور غلطیوں سے پاک ہے“۔(۱۵)

چنانچہ انہوں نے اعتراضات کے ضمن میں نساخ کے اعتراضات نقل کرنے کے ساتھ خود بھی متعدد اعتراضات کیے ہیں، فنی بحثوں میں بھی متعدد مقامات پر نقد کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

”بعض موقعوں پر مرزا صاحب نے جس بلاغت سے مضمون ادا کیا ہے میر انیس سے نہیں ہوسکا“۔(۱۶)

”مرزا صاحب نے اس مضمون کو نہایت خوبی اور صفائی سے ادا کیا ہے، میر انیس صاحب نے اس مضمون کو کئی طرح سے پلٹا لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ بات نصیب نہ ہوئی“۔(۱۷)

اسی طرح انہوں نے مرزا دبیر کی صرف کم مایگی ہی نہیں دکھلائی ہے بلکہ جہاں وہ انیس سے برتر تھے ان کے محاسن کا بھی ذکر کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے اور جو دردانگیز سماں دکھایا ہے کسی سے آج تک نہ ہوسکا"۔(۱۸)

البتہ بحیثیت مجموعی علامہ شبلی نے دبیر پر میر انیس کی برتری ثابت کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر منصف شخص کلام انیس کے مطالعے و جائزے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے گا جس پر علامہ شبلی پہنچے، بطور نمونہ یہاں اس کی ایک مثال نقل کی جاتی ہے، میر انیس کے مرثیے کا ایک شعر ہے:

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اس شعر میں بلاغت کے جو راز پنہاں ہیں اس کے بارے میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"موقع کی حالت یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ اپنا نام اس حیثیت کے ساتھ بتائیں جس سے کسی قدر شرف اور فضیلت کا اظہار ہوتا کہ پوچھنے والا سمجھ سکے کہ یہ وہی امام حسین ہیں جن کا وہ غائبانہ دلدادہ اور مشتاق ہے لیکن امام ممدوح کو خاکساری مانع آتی ہے وہ اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ میں حسین ہوں لیکن چونکہ مستفسر قرائن سے اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ محض نام لینے سے بھی غالباً پہچان لے گا اور اس لیے حسین کہنا بھی گویا اپنے آپ کو امام کہنا ہے اس بنا پر نام لینا بھی ایک طرح پر شرف اور فضیلت کا اظہار ہے، اس لیے خالی نام لیتے ہوئے بھی آپ شرما جاتے ہیں اور شرم سے آپ کی گردن جھک جاتی ہے، اس بنا پر شاعر کہتا ہے کہ ؎

مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

لیکن شاعر کو جو امام حسینؑ کی عظمت کے اثر سے لبریز ہے گوارا نہیں ہوتا کہ آپ کا نام اس سادگی سے لیا جائے، اس کے نزدیک امام علیہ السلام اگر اپنے آپ کو بادشاہ مشرقین کہتے تو یہ خودستائی نہ تھی بلکہ محض ایک واقعہ تھا جس طرح رسول اللہ ﷺ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کہتے تھے اور یہ خودستائی نہیں خیال کی جاتی تھی، شاعر کے دل میں حسرت ہے کہ کاش امام علیہ السلام نے بیان واقعہ ہی کیا ہوتا اس کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے ع

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں

تاہم اس سے خیال بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام کی عالی ظرفی اور شرافت نفس کا یہی اقتضا تھا کہ وہ خاکساری کو بیان واقعہ پر مقدم رکھتے۔ اس موقع پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اسی واقعے کو دبیر صاحب نے اس طرح باندھا ہے: ع

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنے کی جو بحث ہے اس کے فیصلے کے لیے دونوں کے صرف یہ دونوں مصرعے کافی ہیں"۔ (۱۹)

یہ موازنہ اپنی جگہ لیکن میر انیس نے شاعری کو جولازوال رفعتیں عطا کی ہیں اس میں ان کا کوئی حریف نہیں، ڈاکٹر فضل امام نے سچ لکھا ہے کہ:

"اردو شاعری کی طویل تاریخ اور روایت میں میر انیس کی شخصیت اور ان کا فن کسی رسمی تعارف کا محتاج نہیں کیونکہ انیس نے اپنی فکروفن کی وسعتوں سے صرف اردو مرثیہ نگاری کو ہی توانا اور موثر نہیں بنایا بلکہ اردو شاعری کو ہر نقطہ نظر سے باآبرو بنادیا"۔ (۲۰)

البتہ اس میں کسی قدر سچائی ضرور ہے کہ شبلی سے تسامح ہوا اور انہوں نے ایک دو مصرعے یا شعر جو مرزا دبیر کے کلام میں نہیں پائے جاتے ان سے منسوب کر کے بحث کی اور فیصلہ انیس کے حق میں سنایا مثلاً یہ مصرعہ: ہے ہے میرے دیور، میرے دیور، میرے دیور

حیات دبیر کے مصنف افضل حسین ثابت نے لکھا ہے کہ یہ مصرعہ دبیر کے کسی مرثیہ میں نہیں پایا جاتا (۲۱)۔ اسی طرح یہ مصرعہ ؎ زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے کے متعلق المیزان کے مصنف نظیر الحسن فوق رضوی نے لکھا ہے کہ یہ مرزا دبیر کا نہیں بلکہ ان کے ایک شاگرد حکیم قدیر الدولہ قدیر کا ہے (۲۲)۔ اسی طرح تلوار کی تعریف میں یہ شعر ؎

جب خوں میں بھری فوج کے انبوہ سے نکلی غل یہ تھا کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی

بھی ان کے مطبوعہ مراثی میں موجود نہیں ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذکورہ مصرعے یا شعر علامہ شبلی نے دبیر سے قصداً منسوب کیے؟ اور یہ سہواً گران سے سرزد نہ ہوتا تو کیا دبیر انیس کے مدمقابل یا برتر ہو جاتے؟ اس

مفروضے کی حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے عہد کے مآخذ سے بھرپور استفادہ کیا، ان کی تنقیح میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی جیسا کہ موازنہ میں انہوں نے اس کی تفصیل پیش کی ہے (۲۳)۔ تاہم وہ ان تسامح سے اپنا دامن نہیں بچا سکے جو مطبوعہ مراثی میں الحاقی تھے یا ان میں تصرفات ہوئے تھے، مراثی انیس و دبیر کی صحت کا مسئلہ نہ صرف عہد شبلی میں طے نہیں ہوسکا تھا بلکہ آج تک صحت کا التزام جس قدر ہونا چاہیے نہ ہوسکا۔ شبلی کے ان تسامحات کو تسلیم کرلینے کے باوجود فنی لحاظ سے دبیر کی برتری ثابت نہیں ہوتی۔

بعض نقادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ شبلی نے دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور ان کا وہ کلام جو فنی لحاظ سے انیس سے برتر یا بہتر تھا اسے پیش ہی نہیں کیا (۲۴)۔ حالانکہ یہ ذوقی معاملہ ہے، شبلی کے مخالفین و معاندین اس رتبہ اور اس ادبی و تنقیدی حیثیت کے حامل نہیں جو شبلی کا طرہ کمال تھی، ان امور کا شبلی سے بڑھ کر کون اندازہ داں ہوسکتا ہے، اصلاً یہ اعتراض برائے اعتراض ہے۔

موازنہ انیس و دبیر محض تنقیدی نظریات کا مجموعہ نہیں بلکہ اردو میں عملی تنقید کا پہلا نمونہ ہے، موازنہ پر تنقید بلکہ تنقیص کا طوفان کھڑا کیا گیا لیکن کوئی اس حقیقت سے انکار کرسکتا ہے کہ اس سے برتر تو کجا اس کے برابر کی بھی کوئی کتاب آج تک نہیں پیش کی جاسکی، سچ یہی ہے کہ یہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک بے نظیر شاہ کار ہے۔

موازنہ کے تجزیے میں ہمارے نقادوں سے کئی تسامح ہوئے وہ ''دبیریوں'' کے غوطہ میں الجھ گئے اور اس کا تجزیہ عہد شبلی کے پس منظر کے بجائے اپنے عہد و ماحول اور اپنے عہد کی تحقیقات و انکشافات کی روشنی میں پیش کیا، دوسرے یہ کہ پہلے سے یہ تسلیم کرلیا کہ شبلی نے دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے، ان کے محاکموں کی قوت، دلائل کی مضبوطی اور تجزیے کی سنجیدگی کی طرف توجہ نہ دی، بعض نقادوں نے عجیب عجیب مشورے دیے ہیں مثلاً ان کو اس کتاب کا نام موازنہ کے بجائے مطالعہ مراثی انیس رکھنا چاہیے تھا (۲۵) وغیرہ۔ اسی طرح علامہ شبلی نے جن اصولوں کی روشنی میں کلام انیس کا تجزیہ ضروری قرار دیا تھا اور جس پر وہ خود عمل پیرا رہے موازنہ کے نقادوں میں بیش تر نے اس سے اغماض برتا نیز قدیم مشرقی انداز تنقید کے بجائے جدید تنقیدی نظریات سے کام لیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہوگئے اور

موازنہ کی عظمت کو نقادوں کے متضاد اور غیر واضح رویے اور ذہنی تحفظات نے نقصان پہنچایا، ڈاکٹر فضل امام کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے نقاد تنقید کی رو میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں، وہ موازنہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"شبلی کا انتشار ذہنی یوں تو ان کی سبھی کتب کا طرہ امتیاز ہے لیکن اس کی واضح اور مضحکہ خیز مثالیں موازنہ میں ملتی ہیں"۔ (۲۶)

اب اس کو کیا کہا جائے کہ موازنہ سے آگے بڑھ کر انہوں نے تمام تصانیف شبلی کا طرۂ امتیاز انتشار ذہنی قرار دے دیا، راقم کا خیال ہے کہ اسے تنقید کے بجائے تبریٰ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ اور اس طرح کی دوسری تنقیدیں دراصل تنقید برائے تنقید ہیں، ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ موافق و مخالف سبھی نے موازنہ کی عظمت کا اعتراف کسی نہ کسی نوع سے ضرور کیا، کسی نے شبلی کے تنقیدی شعور اور دلائل کی مضبوطی کی مدح کی تو کسی نے ان کے فکر و نظر کی داد دی، اسی طرح کسی نے حسن انتخاب کی تحسین کی تو کسی نے موازنہ کے تصور کو لائق ستائش قرار دیا، غرض مدح و قدح کے اس طویل سلسلے نے موازنہ کو حیات جاوداں عطا کی جو اس دور کی کسی ادبی و تنقیدی کتاب کے نصیب میں نہ آسکی حتی کہ مقدمہ شعر و شاعری کے بھی۔

حوالے

(۱) موازنہ انیس و دبیر، ص ۲، دارالمصنفین ایڈیشن ۲۰۰۴ء۔ (۲) ایضاً، ص ۱-۲۔ (۳) ایضاً، ص ۲۔ (۴) ایضاً، ص ۳۔ (۵) سید احتشام حسین، موازنہ انیس و دبیر، ادیب شبلی نمبر، ص ۱۰۴۔ (۶) ایضاً۔ (۷) ایضاً، ص ۲۹۔ (۸) نیر مسعود، موازنہ کے دو جواب، فکر و نظر شبلی نمبر، ص ۴۶۔ (۹) موازنہ انیس و دبیر، ص ۹۹-۱۰۰، دارالمصنفین ایڈیشن۔ (۱۰) ایضاً، ص ۱۷۳۔ (۱۱) ایضاً، ص ۲۴۷۔ (۱۲) مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۳۲۷۔ ملاحظہ ہو المیزان، ص ۳۲ وغیرہ۔ (۱۴) موازنہ انیس و دبیر، ص ۲۳۶۔ (۱۵) ایضاً، ص ۲۳۵۔ (۱۶) ایضاً، ص ۲۹۱۔ (۱۷) ایضاً، ص ۲۹۹۔ (۱۸) ایضاً، ص ۲۹۲۔ (۱۹) ایضاً، ص ۶۶-۶۷۔ (۲۰) مقدمہ و تعارف، موازنہ انیس و دبیر، ص ۵، مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء۔ (۲۱) حیات دبیر، ص ۱۴۱-۵۔ (۲۲) المیزان، ص ۳۲۔ (۲۳) سید عابد علی عابد، موازنہ انیس و دبیر، ص ۸-۲۷ بحوالہ ارشاد نیازی، ص ۱۳۸۔ (۲۴) موازنہ انیس و دبیر، ص ۲۵-۲۷۔ (۲۵) مقدمہ و تعارف، موازنہ انیس و دبیر، ص ۹۔ (۲۶) ایضاً، ص ۱۴۔

تنبیہ الغافلین
ہندوستان کی فارسی ادبی تنقید کے آئینہ میں

نیلوفر حفیظ

اٹھارہویں صدی عیسوی کا زمانہ اگرچہ تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے تنزل کے راستے پر گامزن تھا۔ لیکن اپنے تمام تر زوال کے باوجود اس عہد میں علم وادب کے جو اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ان کی اہمیت وافادیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ دور فارسی زبان وادب کی وسعت اور نثری سرمایے کی اشاعت کے سبب امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ اس عہد میں فارسی شعراء کے بے شمار تذکرے لکھے گئے۔ فرہنگ، تاریخ اور دیگر علوم وفنون پر بھی بکثرت کتابیں تالیف کی گئیں۔ اس صدی کی ایک خاص اور اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے میں فارسی ادبی تنقید باقاعدہ طور پر وجود میں آئی حالانکہ اشعار کی تعریف و تحسین اس عہد سے پہلے بھی کی جاتی تھی۔ لیکن ان کی پرکھ اور معائب ومحاسن کا تجزیہ تحریری شکل میں موجود نہیں تھا۔ یہ بارہویں صدی ہجری کی سب سے اہم خصوصیت ہے کہ اس دور میں فارسی ادبی تنقید نے باقاعدہ ایک فن کی شکل اختیار کی۔ اور بہت سے شعراء وادباء نے اس میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور تاریخی صفحات میں اپنا نقش دوام چھوڑ گئے۔ اس سلسلے میں اولین کوشش سراج الدین علی خان آرزو کی طرف سے کی گئی حالانکہ ادبی معرکے اور شعراء کی آپسی چشمک کی مثالیں تو زمانہ قدیم سے ہی ملتی ہیں مگر باقاعدہ طور پر تحریری شکل میں نہیں۔ خان آرزو نے سب سے پہلے شیخ علی حزیں کی نکتہ چینی کا جواب تحریری شکل میں پیش کیا اور نثری فارسی نقد کی بنیاد ڈالی۔

سراج الدین علی خان آرزو کو ہندوستان میں فارسی ادبی تنقید کا بنیادگذار کہا جاتا ہے، انہوں

استسٹنٹ پروفیسر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ۔

نے ہی سب سے پہلے فارسی ادبی تنقید کا باقاعدہ طور پر آغاز اور فارسی ادبی تنقید کو مبسوط مگر جامع شکل میں پیش کیا۔ ان کے بعد تنقید کا یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا اور فارسی ادب کے حسن میں چار چاند لگاتا رہا، بعد کے لوگوں نے آرزو کے پیش کردہ تنقیدی اصول و نظریات کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا۔ اس طرح خان آرزو نے ادبی تنقید کی داغ بیل ڈال کر ہندوستانی فارسی داں طبقے کے سر کو فخر سے بلند کر دیا۔

تنبیہ الغافلین کی تالیف و تصنیف کے پس پردہ ایک دلچسپ واقعہ ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے:

شیخ محمد علی حزیں لاھجی اٹھارہویں صدی عیسوی کے نہایت مشہور و معروف ایرانی شاعر گردانے جاتے تھے جو نامساعد حالات کی وجہ سے ایران چھوڑ کر ہندوستان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، ہندوستانی فارسی داں طبقے میں انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اہل زبان ہونے کی وجہ سے ان کی بڑی عزت تھی، خود سراج الدین خاں آرزو، علی حزیں کی فارسی دانی اور بلند علمی مرتبے کے قائل تھے لیکن حزیں ایک خود پسند و خود بین قسم کے انسان تھے۔ ان کو اپنے اہل زبان ہونے پر بہت ناز تھا وہ کسی بھی فارسی داں ہندوستانی کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے ان کو اہل ہند کی فارسی دانی پر سخت اعتراض تھا، وہ کہتے تھے کہ ہندوستان میں جو فارسی رائج ہے یہ فارسی نہیں ہے بلکہ ہندی اور فارسی سے ملا کر یہاں کے عالموں نے ایک نئی زبان بنالی ہے۔ وہ ناصر علی سرہندی کے منظوم اور بیدل کی نثر کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

"نظم ناصر علی و نثر بیدل بہ فہم نمی آید، اگر مراجعت ایران دست دہد، برای ریشخند بزم احباب راہ آوردی بہتر ازیں نیست"۔(۱)

ہندوستانیوں کے علم و ادب سے بدگمانی نے ان سے یہاں تک کہلوا دیا:

"بابا در ملک ہندوستان اعداد نماز پنج گانہ را کسی نمی داند بہ حقائق علمی و دقائق حکمی چہ رسد"۔(۲)

انہوں نے اپنی فارسی دانی کے زعم میں یہ اعلان بھی کر دیا کہ انہیں دار الخلافت میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہ آیا جو رتبۂ فضیلت رکھتا ہو۔ حزیں کی اس زبان درازی اور سخت کلامی کا نتیجہ یہ ہوا

کہ ہندوستان کے فارسی داں حلقے میں ان کے خلاف سخت بے چینی اور ناراضگی پیدا ہوگئی یہاں کے علماء وادباء نے شیخ علی حزیں کی خوش فہمی کو دور کرنے اور اپنے علم و ہنر کا لوہا منوانے کا بیڑہ اٹھایا۔ انہیں علماء میں خان آرزو بھی تھے جنہوں نے حزیں کو سبق سکھانے کے لیے عملی و علمی قدم اٹھایا۔

سراج الدین علی خان آرزو فارسی زبان وادب کے جید عالم تھے، ان کی حساس طبیعت نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا کہ ہندوستان کے فارسی داں ادیبوں اور شاعروں پر اہل ایران اور علی حزیں کی برتری کا احساس اس قدر غالب ہے کہ یہاں کے شعراء وادباء اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے بجائے اہل زبان کے نقش قدم پر چلنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں اور باصلاحیت ہوتے ہوئے بھی احساس کمتری کا شکار ہیں، آرزو اہل ہند کے دل و دماغ سے اس احساس برتری کو ختم کرنا چاہتے تھے اور قدرت نے ان کو بہت جلد ایسے مواقع فراہم کردیے کہ انہوں نے ایرانیوں سے اپنی فارسی دانی کی لیاقت کو منوا کر ہی دم لیا، بقول راز یزدانی:

> ”اس حق کو منوانے کے لیے خان آرزو کو بڑے پاپڑ بیلنا پڑے لیکن وہ ایک آہنی اور مضبوط ستون کی طرح اپنی جگہ پر اڑے رہے اور ایرانیوں سے ”صاحب قدرتان“ کے اس حق کو منوا کر ہی چھوڑا“۔(۳)

ایرانیوں سے داد تحقیق و تحسین پانے کے لیے دیگر لوگوں کی طرح صرف خان آرزو نے زبانی جمع خرچ کا سہارا نہیں لیا بلکہ باقاعدہ طور پر تحریری تنقید کا آغاز کردیا۔ ”تنبیہ الغافلین“، ”احقاق الحق“، ”داد سخن“ اور ”سراج منیر“ وغیرہ جیسی گراں قدر تنقیدی کتابیں تصنیف کیں اور ثابت کیا کہ اہل ہند فارسی زبان وادب کے معاملے میں اہل زبان سے اگر بڑھ کر نہیں تو کسی بھی لحاظ سے کمتر بھی نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں جو سب سے پہلی باقاعدہ تحریری کوشش منظر عام پر آئی وہ خان آرزو کی تنبیہ الغافلین ہے۔

تنبیہ الغافلین ہندوستان میں لکھی جانے والی فارسی نثر کی پہلی تنقیدی کتاب تصور کی جاتی ہے، ممکن ہے کہ اس سے پیشتر بھی اس موضوع پر کتابیں تالیف کی گئی ہوں مگر اب تک اس جیسی کسی دوسری کتاب کا کوئی سراغ نہیں ملا اس لیے اس دعوی میں کوئی مضایقہ نہیں کہ ہندوستانی فارسی تنقیدی ادب میں ”تنبیہ الغافلین“ کو شرف اولیت حاصل ہے۔

''تنبیہ الغافلین'' کی صحیح تاریخ تالیف کا ابھی تک علم نہیں ہوسکا ہے خود آرزو اور دیگر تذکرہ نویسوں نے اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، منوہر سہائے انور کے مطابق علی حزیں اور خان آرزو کے درمیان معرکہ آرائی کا آغاز ۱۱۵۴ھ کے بعد اور ۱۱۵۶ھ سے قبل ہوا (۴)۔لہذا غالب گمان ہے کہ یہ رسالہ ۱۱۵۷ھ سے ۱۱۶۱ھ کی درمیانی مدت میں تحریر کیا گیا ہو۔

اہل علم واقف ہیں کہ ہندوستان کے فارسی تنقیدی ادب میں بہت جلد اس رسالہ نے اہل تحقیق کو اپنی جانب متوجہ کیا البتہ اس کو وہ حسن قبول نہ ہوسکا جس کا وہ مستحق تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ علی حزیں کے خیر خواہوں نے اس کے رد میں کئی کتابیں تصنیف کیں مثلاً وارستہ کی ''رجم الشیاطین''، فتح علی گردیزی کا ''ابطال الباطل'' اور امام صہبائی کا ''قول فیصل'' وغیرہ لیکن اس کے باوجود بھی تنبیہ الغافلین کی اہمیت اپنی جگہ مسلم رہی ہے۔

آرزو کی اس انتہائی جرأت مندی کے پیچھے کہیں نہ کہیں ان کی اپنی رنجش اور بغض کا بڑا دخل تھا جو گو کہ شیخ علی حزیں اور اہل ایران کے طرز عمل کے رد عمل کے طور پر ہی سہی سامنے آیا، بہر حال یہ عالمانہ، محققانہ اور دانش مندانہ قدم تھا، انہوں نے علی حزیں کی طرح بے بنیاد ہجو اور بدگوئی کا سہارا نہ لیتے ہوئے اپنی علمی صلاحیت اور قابلیت سے ثابت کیا کہ انسان کو نخوت اور تکبر کے بجائے اپنی قوت فہم اور غور وفکر کو بروئے کار لانا چاہیے تاکہ اس کو پشیمانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

آرزو نے یہ اعتراضات اپنے شاگردوں کو زبانی یاد کرائے جہاں جاتے وہ اعتراضات سنائے جاتے اس طرح لوگوں کی نظر میں حزیں کی ہندوستان سے نفرت اور ان کے سرقوں کا پردہ فاش ہوا اور روز بہ روز لوگوں کی نگاہوں میں ان کی اہمیت کم سے کمتر ہوتی گئی۔(۵)

بعض محققین نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ خان آرزو کے تمام اعتراضات ذاتی عداوت کی بنا پر تھے لہذا ان اعتراضات کو زمرۂ تنقید میں نہیں رکھا جانا چاہیے اور اس رسالے کو آپسی رنجش اور تعصب کا نتیجہ سمجھا جانا چاہیے لیکن لوگوں کے یہ آراء حقیقت پر مبنی نہیں ہیں بے شک تنقید کرتے وقت اعتدال اور انصاف کا دامن کہیں کہیں ان کے ہاتھ سے چھوٹ بھی گیا ہے۔جس کی وجہ سے کتاب کے مطالعے کے دوران ان کی خود پسندی اور شدت پسندی کی جھلک دکھائی پڑ جاتی ہے لیکن بیشتر مواقع پر انہوں نے انصاف سے کام لینے کی بھرپور کوشش کی ہے اور وہ اپنی اس

کوشش میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ راز یزدانی لکھتے ہیں:

''خان آرزو کے اعتراضات کو اس لیے محض اعتراض نہیں کہا جاسکتا کہ ایرانیوں پر جو بے جا اعتراض کیے جاتے ہیں خان آرزو اس کا ذکر کرکے ان کا بھی رد کرتے ہیں، اس سلسلے میں انہوں نے حاجی جعفر خان تبریزی، ذوقی داغستانی، عماد الدین فقیہ کرمانی، کمال خجندی، مرزا بلگرامی اور محمد حسین رضوان وغیرہ کے ساتھ کافی انصاف کیا ہے''۔(۶)

حاکم لاہوری جو خان آرزو اور علی حزیں کے معاصرین میں سے ہیں انہوں نے اپنی یہ رائے پیش کی ہے:

''آنچہ خان آرزو در تنبیہ الغافلین بر اشعارش ایراد گرفت اکثر آن از ستم شریکی است۔ مگر در بعض موقع گرفت بجا است''۔(۷)

آرزو نے اٹھارہویں صدی میں تنقید کا جو طریقہ اپنایا وہ موجودہ طریقہ تنقید سے بالکل مختلف تھا اس دور کی تنقید یا تو صرف محاسن پر مشتمل ہوتی تھی یا معائب ونقائص اور اعتراضات پر مبنی۔ لیکن ''تنبیہ الغافلین'' میں علی حزیں کے کلام پر آرزو کی تنقید اس زمانے کے حالات اور ادبی ماحول کے پیش نظر بہت زیادہ قابل اعتراض نہیں ٹھہرائی جاسکتی کیوں کہ ان کے یہاں اتنی سختی اور شدت پسندی نہیں جتنی علی حزیں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ آرزو کو یہ سخت رویہ اس لیے اختیار کرنا پڑا کیونکہ اگر وہ سختی سے کام نہیں لیتے تو نہ صرف ان کی بلکہ اہل ہند کی بھی کمزوری ظاہر ہوجاتی اور ہمیشہ کے لیے ان پر نااہل ہونے کی مہر ثبت ہوجاتی لہذا ان کا یہ طرز تنقید اس زمانے کے ماحول کے عین مطابق، مناسب وموزوں تھا، موجودہ زمانے کے تنقیدی ماحول سے اس کے اصول و ضوابط قدرے مختلف تھے لہذا اس کو سائنٹفک تنقید کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا لیکن زمرۂ تنقید سے خارج بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اب خان آرزو کے چند ناقدانہ اعتراضات ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے شیخ علی حزیں کے کلام پر کیے ہیں آرزو فارسی زبان وادب کے ایک مزاج شناس عالم اور فرہنگ نویس ہیں۔ فارسی زبان کے اصول وقواعد پر ان کی گہری نظر ہے لہذا انہوں نے حتی الامکان اس بات کی

کوشش کی ہے کہ جذبات اور ذاتیات کے بجائے اصولوں کو اپنے پیش نظر رکھیں اور وہ اپنی اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن اس سچائی سے بھی منہ نہیں موڑا جاسکتا ہے کہ تنقید کرتے وقت اکثر جگہوں پر غیر جانب دارانہ روش اختیار نہیں کرسکے ہیں اور اعتدال کا دامن ان کی تمام تر احتیاط کے باوجود ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے، بارہویں صدی ہجری میں مختصر تنقید کا رجحان زیادہ تھا اور آرزو نے بھی وہی طریقہ ملحوظ رکھا ہے، بعض جگہوں پر مفصل تنقید بھی کی ہے مگر تفصیلی تنقید کی جھلک ان کی پوری کتاب میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر سید محمد اصغر لکھتے ہیں:

"ان کی تنقید کا طرز بالکل یہی ہے انہوں نے بھی الگ الگ شعر پر مختصر اور کہیں تھوڑی مفصل طریقے سے تنقید کی ہے"۔(۸)

خان آرزو ایک محقق اور تنقید نگار کی حیثیت سے ممتاز اور سربرآوردہ شخص تھے سچائی اور انصاف ان کی سرشت میں داخل تھا لیکن اس کے باوجود اس کتاب کو تالیف کرتے وقت وہ مکمل طور پر انصاف و اعتدال سے کام نہ لے سکے ہیں اور اکثر مقامات پر ان کی بے اعتدالی ان کی ذاتی عداوت و مخاصمت کا نتیجہ محسوس ہوتی ہے۔

"خان صاحب نے جس ذہنیت کے ساتھ اس کام کو شروع کیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ نکتہ چینی میں حد اعتدال کو قائم نہ رکھ سکیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا"۔(۹)

ذیل میں علی حزیں کے کچھ اشعار اور آرزو کے ان پر اعتراضات کو پیش کیا جارہا ہے جس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوگا کہ اس دور میں کیسا طرز تنقید رائج تھا اور شعراء و ادباء کس انداز سے غور و فکر کرتے تھے اور ان کے یہاں شعر کی پرکھ کے کون سے پیمانے تھے، جن کو استعمال کرکے وہ تنقید کرتے تھے۔ شعر حزیں

مژگان بہم نمی زنم از شور رستخیز　　　غوغای حشر خواب پریشان عاشق است

اعتراض آرزو "از مصرع اول چناں مستفاد می شود کہ از شور رستخیز مژگان بہم نمی زنم و خواہم نمی برد در این صورت معنی مصرع دوم مربوط نمی گردد"۔(۱۰)

مندرجہ بالا شعر علی حزیں کا ایک عمدہ اور بلند پایہ شعر ہے غالباً خان آرزو اس شعر کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں، ان جیسے ذی استعداد اور صاحب صلاحیت ناقد سے اس قسم کی توقع نہیں کی جاسکتی، یہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے محض ادبی مخاصمت اور ذاتی ناراضگی کے سبب اس شعر پر تنقید کی ہوگی۔اس شعر کی عمدگی کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ آرزو کی اس شعر پر تنقید ہندوستان کے فارسی گو شعراء پر علی حزیں کی بے جا اور نامناسب تنقید کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔شعر حزیں

جن و انس و پریم در خط فرمان بودند　　　داغ عشق تو بہ از مہر سلیمانم بود

اعتراض آرزو: ''در کتب لغت ''پری'' را ترجمہ لفظ ''جن'' نوشتہ اند درین صورت لفظ پریم بسیار بی موقع باشد و در صورتی کہ مراد از پری اشخاص خوش صورت از جنس جن بود چناں کہ مطلع شعراء است درایں دیو مقابل آن می باید نہ جن وانس و پری کاش ایں بیت را مطلع می کرد چنیں می گفت

جن و انس و پری و دیو بہ فرمانم بود　　　داغ عشق تو بہ از ملک سلیمانم بود''(۱۱)

اس شعر پر بھی خان آرزو کی تنقید مناسب و موزوں معلوم نہیں ہوتی کیونکہ لغت میں پری کے معنی صرف جن کے نہیں بلکہ ''جن کی عورت''، ''نہایت حسین و خوب صورت عورت'' اور گزرا ہوا ''پرسوں کا دن'' بھی ہے۔علی حزیں نے غالباً اس شعر میں جن سے مراد نہایت حسین و خوب صورت عورت مراد لی ہے، ورنہ ایک ہی مصرع میں ایک لفظ کو دوبار لانے کی غلطی کی توقع علی حزیں جیسے قادر الکلام شاعر سے ہرگز نہیں کی جاسکتی بے شک آرزو کی اصلاح نے شعر کی دلکشی کو افزوں کردیا ہے لیکن اس سے علی حزیں کے کہنے کا جو مقصد ہے، اس میں قدرے تبدیلی آجاتی ہے، دوسرے یہ کہ علی حزیں کی غزل کا یہ چوتھا شعر ہے لیکن آرزو کی اصلاح سے یہ بھی مطلع کا شعر بن جاتا ہے۔شعر حزیں

فریاد کہ دور چرخ مارا　　　چوں کن دائرہ درمیان گرفت

اعتراض آرزو: ''ہر چند دور فلک را بہ دائرہ تشبیہ دادہ لیکن چوں معنی دور دائرہ نزدیک بہم است پس بہتر آنست کہ بہ جائی دائرہ لفظ مرکز باشد و این ہر چند سکتہ دارد لیکن سکتہ خفیفہ و آں حرکتی است کہ در اشعار اساتذہ بیش از حد است''۔(۱۲)

آرزو کا کہنا ہے کہ بجای دائرہ لفظ کے مرکز کا استعمال زیادہ برمحل ہوتا مگر ان کا یہ سوچنا درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ علی حزیں کا یہ شعر بالکل صاف، سیدھا اور واضح ہے اور خود آرزو نے بھی فلک اور دائرہ کی تشبیہ کی بہتری کا اعتراف کیا ہے لیکن پھر بھی ''دائرہ'' کو غلط بتاتے ہوئے اس کی جگہ لفظ مرکز کے استعمال کو بہتر بتایا ہے لیکن اس لفظ کا استعمال شعر میں سکتہ پیدا کر دیتا ہے اور لطف شعر میں کمی آجاتی ہے۔

اگر آرزو اس شعر میں سنجیدگی سے غور و فکر کرتے اور علی حزیں کے ساتھ ان کے ذہنی سفر میں شریک ہوتے تو وہ اس شعر کی گہرائیوں اور علی حزیں کے حالات کو جان لیتے اور اس کے بعد جب وہ انصاف کے ساتھ تنقید کرتے تو لطف دوسرا ہوتا۔ شعر حزیں

غمگین نمی رود کسے از خاک میکدہ تاہم پیالۂ مہ عیدش نمی ...... کنند

اعتراض آرزو: ''لفظ غمگین دراین جا طرفہ افادہ می کند زیراچہ حاصل معنی آن می شود کہ تاکسی راہم پیالۂ ماہ عید نمی کنند آنکس از خاک میکدہ غمگین نمی ردود و بعد از عمل مذکور غمگین می تواند رفت واین طرفہ چیزی است و گویا سہو الفکر است، درین صورت لفظ ہرگز می باید نہ غمگین''۔ (۱۳)

خان آرزو کا اس شعر پر اعتراض بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ کیونکہ لفظ ''غمگین'' کے استعمال سے شعر کا مطلب پوری طرح خبط ہو جاتا ہے اور شعر کا حسن ضائع ہو جاتا ہے لیکن اگر غمگین کی جگہ ''ہرگز'' کر دیا جائے تو اس کے معنی بالکل صحیح ہو جاتے ہیں اور اس میں تعقید معنوی پیدا ہو جاتا ہے جو شعر کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیتا ہے، اس شعر پر آرزو کی تنقید ثابت کرتی ہے کہ ان میں شعر کو پرکھنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی، اس شعر پر ان کی اصلاح ان کی بے پناہ فارسی دانی کی عمدہ مثال ہے۔

خان آرزو کو حزیں سے یہ شکایت بھی ہے کہ ان کے کلام میں ایسے اشعار بکثرت نظر آتے ہیں جن کے مضامین دیگر شعراء سے اخذ کیے گئے ہیں یہ ان کی فارسی شعر دانی اور ان کی ذہنی صلاحیت پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں، مثلاً شعر حزیں

چون سر کنم حدیث لب لعل یار را گر از نہاد چشمۂ حیوان بر آورم (۱۴)

آرزو کے مطابق یہ شعر مضمون صائب سے لیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح علی حزیں کا ایک

دوسرا شعر......

نالیدن بلبل زنو آموزی عشق زپروانہ بیاموز کان سوختہ را جان شد و آواز نیامد

خان آرزو نے اس شعر کے ضمن میں لکھا ہے کہ: "ہر چند تذکار و ابتذال در دیوان شیخ بہ حدی است کہ انتہا ندارد و مکروہ و سوءِ ادب بلکہ سرمایۂ خجالت خود می داند لیکن سرقہ جریح گلستان واقع است، آن حضرت بلا تفاوت بستہ ظاہراً در طفلی خواندہ، در پیری از یاد رفتہ"۔(۱۵)

تنبیہ الغافلین کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آرزو نے حزیں کے بہت سے اشعار پر بے جا تنقید کی ہے ان کی اکثر جگہوں پر مختصر تنقید کرنے کی وجہ سے نہ تو بات پوری طرح واضح ہو پاتی ہے اور نہ ہی قاری اس کو پوری طرح سمجھ پاتا ہے، مختصر تنقید کی وجہ سے آرزو شعر کی وضاحت کرنے میں کہیں کہیں ناکام بھی ہو جاتے ہیں۔

تنبیہ الغافلین کا مطالعہ اکثر جگہوں پر تشنگی کو بڑھا دیتا ہے اور قاری یہ سمجھ نہیں پاتا ہے کہ شعر میں فنی اعتبار سے کیا کیا خامیاں ہیں، تنبیہ الغافلین میں اکثر مقامات پر انہوں نے مختصر تنقید ہی کی ہے لیکن ان کی یہ مختصر تنقیدیں نہایت مدلل و چست اور اصلاحات نہایت منصفانہ اور ادیبانہ ہیں مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں...... شعر حزیں

دل بردن ماباعث مغروری اوشد آئنہ خود بینی یاراست دل ما

اعتراض آرزو: مصرع اول دو طرف دارد، یکی مناسب مذاق عاشقی نیست"......(۱۶)

شعر حزیں

لبت اکنوں بہ فسوں می برداراز خویش مرا ورنہ این بادہ بہ کام دگران است کہ بود

اعتراض آرزو: کاف کہ بود معلوم نیست کہ بیان کدام چیز است......(۱۷)

شعر حزیں

منم نسائیہ دردانۂ اشک نژاد دل بہ دریا می رسانم

اعتراض آرزو: از لفظ دل لفظ او بہتر است، چنانکہ سخن فہم می داند......(۱۸)

شعر حزیں

از فیض فقر می زند امروز مدتی است کشکول ما بہ کات فغفور پشت دست

اعتراض آرزو: عبارت امروز مدتی است "عجائب عبارتی است"......(۱۹)

شعر حزیں

دل نالاں من تا خاک شد در راہ جاں بازی نوا پی از رکاب نی سواری بر نمی خیزد

اعتراض آرزو: نوا از رکاب برخاستن چہ معنی دارد (۲۰)

مختصر یہ کہ آرزو پہلے شخص ہیں جنہوں نے باقاعدہ طور پر ہندوستان میں فارسی ادبی تنقید کی بنیاد ڈالی ان کی مختصر انداز میں کی گئی تنقیدیں نہایت پرمغز، مدلل اور جامع ہیں انہوں نے ایران نوازی کو ترک کر کے عالم گیر شہرت حاصل کی۔ تنبیہ الغافلین جیسی گراں قدر کتاب تالیف کر کے انہوں نے اہل ہند کے احساس کمتری ختم کرنے کی پوری کوشش کی، اس کے بعد بہت سے لوگ خان آرزو کے ہم نوا بن گئے اور ان کی آواز سے آواز ملائی مثلاً محمد عظیم ثابت جنہوں نے حزیں کے ۵۰۰ شعر منتخب کر کے ثابت کیا کہ انہوں نے دوسرے شعراء کے مضامین اپنے اشعار میں ڈھالے ہیں، اس کے علاوہ کشمیریوں نے بھی "ہجو کشمیر" کا بدلہ ان سے لیا۔

تنبیہ الغافلین ہندوستان میں فارسی ادبی تنقید کی ایک عمدہ اور بہترین مثال ہے اس کے ذریعے فارسی ادبی تنقید کے لیے نئی راہ ہموار اور فارسی شاعری کے مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہوئی اور بعد کے لوگوں نے آرزو کے طرز تنقید کی اتباع کر کے فارسی ادبی تنقید کو اوج کمال تک پہنچایا، آرزو کسی کے مقلد نہیں بلکہ اس میدان میں وہ مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک سچے اور ایمان دار نقاد کے فرائض کو پوری خوش اسلوبی سے نبھایا اور لوگوں کو ایک نیا فکری انداز بخشا۔

خان آرزو نے ایسے دور میں علم بغاوت بلند کیا جب ہندوستانی معاشرے میں ایرانی النسل مسلم الثبوت مانے جاتے تھے اور زبان کے معاملے میں جاہل سے جاہل ایرانی بھی مستند تسلیم کیا جاتا تھا۔ برسوں کے اس احساس کو ختم کرنے کے لیے خان آرزو نے جس عزم و حوصلہ اور استقلال کا ثبوت پیش کیا، اس کی نظیر شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

مراجع و مصادر

(۱) محمد حسین آزاد، نگارستان فارس، ص ۲۱۲، عاکف بک ڈپو دہلی، ۱۹۹۲۔ (۲) ایضاً، ۲۱۳۔ (۳) راز یزدانی،

نقوش، ص ۱۶۷، لاہور، جنوری ۱۹۶۳ء۔ (۴) منوہر سہائے انور، معاصر، ص ۳۲، پٹنہ، مئی 1951ء۔ (۵) ریحانہ خاتون، سراج الدین علی خان آرزو ایک مطالعہ مرتبہ شاہد علی خان، ص ۹۳، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۰۴ء۔ (۶) راز یزدانی، نقوش، ص ۱۶۷، لاہور، ۱۹۶۳ء۔ (۷) عبدالحکیم حاکم لاہوری، مردم دیدہ بہ اہتمام دکتر سید عبداللہ، ص ۶۶، پنجاب اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۱ء۔ (۸) ڈاکٹر سید محمد اصغر، معارف، ص ۲۲۱، اعظم گڈھ، ستمبر ۲۰۰۷ء۔ (۹) شیخ علی حزیں، سفینۂ شیخ علی حزیں، مرتبہ مسعود علی، ص ۳۸، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۳۰ء۔ (۱۰) سراج الدین علی خان آرزو، تنبیہ الغافلین، مصحح دکتر سید محمد اکرم، ص ۲۲، ایران پاکستان انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد، پاکستان، ۱۹۷۷ء۔ (۱۱) ایضاً، ص ۳۳-۳۴۔ (۱۲) ایضاً، ص ۱۷۔ (۱۳) ایضاً، ص ۷۳۔ (۱۴) ایضاً، ص چہل و شش۔ (۱۵) ایضاً، ص ۱۴۱۔ (۱۶) ایضاً، ص ۹۔ (۱۷) ایضاً، ص ۲۷۔ (۱۸) ایضاً، ص ۶۳۔ (۱۹) ایضاً، ص ۹۶۔ (۲۰) ایضاً، ص ۱۰۲۔

اخبار علمیہ

اورنگ زیب کا تحریر کردہ قرآن مجید کا تین سو سالہ قدیم نادر نسخہ جرمنی میں اس کے مالک کی جانب سے نیلام ہونے والا ہے، اس کا حجم 14.5x24 سینٹی میٹر ہے اور یہ واقعی آب زر سے لکھا ہوا ہے، اس کا کاغذ قدرتی مسالوں اور چاول سے تیار کیا گیا ہے، روشنائی میں قیمتی معدنیات یاقوت، زمرد اور دوسرے ہیرے جواہرات کا استعمال ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی تابانی آج بھی برقرار ہے، یہ خاص اورنگ زیب کے ذخیرۂ مخطوطات میں شامل تھا، اس کی کتابت میں اورنگ زیب کے علاوہ دوسرے ماہرین فن کا خون جگر بھی شامل ہے، نیلامی جرمنی کے شہر ہامبرگ سبو یک آکشن ہاؤس میں ہوگی۔

اقوام متحدہ نے دس برس قبل ۲۰۱۵ء تک تمام بچوں کو بلا تفریق مرد و زن تمام سطحوں پر اسکول بھیجنے کا عزم ظاہر کیا تھا، لیکن دنیا کے ۶۰ غریب ملکوں کی ۱۰۰ تنظیموں پر مشتمل عالمی تعلیمی مہم کی تیار کردہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پوری دنیا میں چھ کروڑ ۹۰ لاکھ بچے اسکول نہیں جارہے ہیں اور ۱۷ کروڑ ۱۰ لاکھ لوگوں کو خط افلاس سے اوپر نہیں لایا جاسکا ہے، رپورٹ کے مطابق اگر سائنس داں اشیائے خورد و نوش میں جنیاتی تبدیلی لاسکتے اور تسخیر مریخ کر سکتے ہیں تو بلاشبہہ وہ ایسے اسباب وحل بھی تلاش کر سکتے ہیں جن کو اپنا کر اسکول بھیجنے کی مہم میں انقلاب لایا جاسکتا ہے، یہ بات بھی طے ہے کہ اگر تعلیمی بجٹ کو مالی بحران سے نہیں بچایا گیا تو گذشتہ ساری محنت بے معنی ہوجائے گی۔

دائرۃ المعارف حیدرآباد کی شہرت آفاقی ہے، اسلامی تحقیقات و مطالعات اور نشر و اشاعت میں اس کے اہم کردار کی ایک تاریخ ہے، خبر ہے کہ اس کی ذمہ داری اقتصادیات کے کسی پروفیسر کو تفویض کی گئی ہے، یہ ستم ظریفی ہے کہ جس ذمہ داری کے لیے کم از کم عربی زبان پر عبور اور اسلامی علوم میں درک رکھنا شرط ہے اس کو کسی کامرس کے مدرس کے حوالے کر دیا جائے، یہ خبر بھی ہے کہ بعض خدمت گذاروں کو ان کی خدمات سے برطرف کیا جارہا ہے، تہذیب و ثقافت کی خبر رکھنے والوں کو اس کی خبر بھی ہونی چاہیے۔

مشہور ماہر طبیعیات اسٹیفن ہاکنگ نے اس سے قبل اپنی تحقیقات میں خالق کائنات کے

وجود و امکان کے نظریہ کو مسترد نہیں کیا تھا لیکن اب اس نے اپنی تازہ ترین تصنیف ''دی گراونڈ ڈائز ئین'' میں نہ صرف اس کے حامیوں کے سُر میں سُر ملایا ہے بلکہ یہ احمقانہ دعوا بھی کیا ہے کہ تخلیق کائنات کے لیے خالق کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس میں ایسے قوانین فطرت موجود ہیں جن کے تحت یہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آگئی ہے اور یہ گویا ایک ناگزیر طبیعیاتی عمل کا نتیجہ ہے۔

اسلامی آرٹ کے دنیا کے سب سے بڑے میوزیم کو ۸ سالہ منصوبہ کے تحت زائرین کے لیے بند کر دیا گیا تھا، خبر ہے کہ اس کو دوبارہ تزئین و آرائش کے بعد رمضان کے پہلے ہفتہ میں کھول دیا گیا ہے، اس کا افتتاح صدر مصر حسنی مبارک نے کیا، میوزیم کی ۲۵ گیلریوں میں ایک لاکھ فن پاروں میں صرف ڈھائی ہزار کو منتخب کیا گیا ہے، جس میں قرآن مجید کے نادر قلمی نسخے، خانہ کعبہ کی کنجی، ۶۹۷ء کا قدیم ترین دینار بطور خاص قابل ذکر و جاذب نظر ہیں، ان کے علاوہ عہد عثمانی کے ظروف، فلکیات، کیمیا اور فن تعمیر کی تدریس و تجربات میں استعمال شدہ آلات بھی ہیں، یہ میوزیم ۱۹۰۳ء میں ملک کے عظیم ثقافتی ورثہ اور نادر اشیاء کے تحفظ کے مقصد سے قاہرہ میں قائم کیا گیا تھا۔

امریکہ کے ایک کثیر الاشاعت اخبار ''واشنگٹن پوسٹ'' کی اطلاع ہے کہ وہاں زیتون نامی پہلے مسلم کالج کا افتتاح عمل میں آیا ہے، فی الحال اس میں عربی زبان، دینیات اور قوانین اسلامی کی تعلیم دی جاتی ہے، رپورٹ کے مطابق امریکی نژاد ایک نو مسلم شیخ حمزہ یوسف نے ۱۹۹۶ء میں ایک ادارہ قائم کیا تھا جس میں عربی اور اسلامیات کی بعض کتابیں زیر درس تھیں مگر اب امام زید شاکر اور حاتم بازیان کے تعاون اور کوششوں سے اس ادارہ نے ایک مکمل کالج کی شکل اختیار کر لی ہے، کالج کے بنیاد گزار ممبران نے بتایا کہ امریکہ میں مقیم مسلمان انفرااسٹرکچر اور تعلیمی اداروں کی تعمیر میں خصوصی دلچسپی لے رہے ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے، انہوں نے مزید کہا کہ مستقبل میں تعلیم بالغان، اسلامی اقتصادیات اور مذہبی تربیت کے شعبوں کے قیام کا بھی ارادہ ہے۔

اردن کی وزارت اوقاف نے اذان اور اقامت کے سوا جہری نمازوں و خطبہ جمعہ اور تراویح میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی لگا دی ہے، جس کے سبب مذہبی حلقوں میں ایک نئی بحث چھڑ گئی ہے، اس کے جنرل سکریٹری محمود البرعود نے اس کا مقصد کتاب الٰہی کے احترام اور تقدس کا لحاظ رکھنا

بتایا ہے، ان کا کہنا ہے کہ قرآن کو خاموشی سے سننے اور اس کی آواز کو ان ہی لوگوں تک جو بغور سن رہے ہوں محدود رکھنے کا حکم خود قرآن سے ثابت ہے، موجودہ طرز عمل سے عام لوگ جن تک اس کی آواز پہنچتی ہے نہ ہی خاموش رہ پاتے ہیں اور نہ ہی بغور سن پاتے ہیں، جس سے قرآنی حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور آیات کی جانب عدم التفات سے اس کا تقدس بھی پامال ہوتا ہے، رپورٹ کے مطابق وزارت نے یہ فیصلہ شہریوں کی ایک بڑی تعداد کی شکایت پر کیا ہے، اس فیصلہ کی خلاف ورزی کرنے والے ائمہ اور موذنین کے خلاف کارروائی بھی کی جاسکتی ہے۔

واشنگٹن کے اسلامک سنٹر کے سربراہ محمد ناصر کا بیان ہے کہ فلوریڈا کے ایک پادری کی جانب سے کتاب اللہ کو آگ کے حوالہ کرنے کی دھمکیوں اور گراؤنڈ زیرو میں بیت اللہ کی تعمیر کی مخالفت کے بعد صرف دارالحکومت میں ۱۸۰؍افراد نے مذہب اسلام اختیار کیا ہے، گذشتہ ۱۲؍برسوں میں امریکہ میں سالانہ ۱۰۰ مسجدوں کی تعمیر کے تناسب سے ۱۲ سو مسجدیں تعمیر کی جاچکی ہیں جو امریکہ میں اشاعت اسلام کی واضح علامت ہے۔

ہندوستانی نظام عدلیہ بالخصوص عدالت عظمی کے متعلق یہ خبر شرم سار کردینے والی ہے کہ یہاں کے ۱۶ خصوصی ججوں میں نصف یعنی ۸ بدعنوان تھے، تفصیلات کے مطابق سابق وزیر قانون شانتی بھوشن نے اپنے ایک آرٹیکل میں لکھا تھا کہ ''عدالت عظمی میں زبردست بدعنوانیاں ہیں''۔ اس انکشاف کے بعد ان کے خلاف سپریم کورٹ میں مقدمہ چل رہا ہے، اب خبر ہے کہ انہوں نے عدالت عظمی کو ان ۸ ججوں کے ناموں کی فہرست حوالہ کردی ہے۔ اسی کے ساتھ چھ جج صاحبان کی دیانت وایمان داری کا اعتراف بھی کیا ہے۔

سائنس داں ایک عرصے سے روبوٹ کو ہر چیز اٹھالینے کے قابل بنانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے، اب انہوں نے لچک دار سیمی کنڈکٹر میٹریل سے تیار شدہ ایک مصنوعی جلد بنانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے، اس ایجاد کے بعد اب روبوٹ انڈا یا اور اس قسم کی چیزیں اٹھاسکیں گے، حیرت کی بات ہے کہ اس مصنوعی جلد میں تھوڑی بہت قوت حس بھی موجود ہے۔

ک، ص اصلاحی

تلخیص و تبصرہ

شہر فاس۔ ماضی وحال کے آئینے میں

بلاد مغرب کے تاریخی شہروں میں ایک شہر فاس ہے، اس کی قدیم تاریخی مسجدیں، یونیورسٹیاں، مدارس، بازار، محلات اور قدیم برجیاں اس کی تاریخی عظمت کی آئینہ دار ہیں، اس کے علاوہ اس کی حسین و سرسبز و شاداب لہلہاتی وادیاں اور اس کے قدرتی مناظر دامن دل کو اپنی جانب کھینچتے اور دوسرے شہروں سے اس کو ممتاز کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عرب اور دوسرے سیاحوں کے لیے یہ شہر شروع سے ہی باعث کشش ہے، شہر فاس قدیم و جدید دو حصوں میں منقسم اور دونوں قسم کی تاریخیں اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس طرح قدیم و جدید تاریخ کے ایک سنگم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، شہر فاس کا وہ حصہ جو مغربی وطنی وراثت کا حامل ہے، آٹھویں صدی عیسوی میں ادریسؒ ثانی کا آباد کیا ہوا ہے، اس کے بعد اندلس کے مہاجرین نے اس کو اپنی اقامت گاہ بنائی، جن کی اکثریت ماہرین فن کی تھی اور انھوں نے اپنی کوشش اور خداداد صلاحیت سے شہر فاس کو اعلیٰ تہذیب و تمدن کا حامل شہر بنا دیا۔

اس کے بعد گیارہویں صدی عیسوی میں یوسف بن تاشفین کے عہد میں اس شہر کی تعمیراتی اور اقتصادی سرگرمیاں عروج پر تھیں، پھر بارہویں صدی عیسوی یعنی موحدین کے عہد میں اس کی مزید ترقی ہوئی، مسجد قرویین اسی عہد کی یادگار ہے جو فکری و دینی سرگرمیوں کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گئی تھی، چنانچہ جب مرینیین نے شہر فاس پر قبضہ کیا تو اس کی تہذیبی ترقی اور اقتصادی خوش حالی کے سبب اس کو اپنا دار السلطنت بنایا، ۱۶۶۶ء میں علوی حکومت کے بانی مولیٰ رشید نے جس کا خاندانی اور نسلی تعلق شاہ مغرب محمد سادس سے ملتا ہے، شہر فاس کو راجدھانی باقی رکھا، البتہ جب اس کا حقیقی بھائی مولیٰ اسماعیل حکمراں ہوا تو اس نے شہر منکاس کو اپنا دار السلطنت بنایا، پھر مولیٰ الحسن اول کے عہد (۱۸۹۴-۱۸۷۲ء) میں اس شہر کو جدید ترین سہولیات میسر آئیں اور سڑکیں ڈامر سے بنائی گئیں اور بجلی اور ٹیلی فون وغیرہ کی سہولت بہم پہنچائی گئی۔

شہر میں داخل ہوتے ہی ایسی تنگ گلیوں اورنشیبی راستوں سے گذرنا پڑتا ہے جو دائیں بائیں دونوں جانب نکلتے ہیں، سامنے تاریخی مقامات کی زیارت کے پرلطف اور حسین مناظر آجاتے ہیں۔ جس میں بعض کا مجملاً ذکر کیا جاتا ہے:

مسجد اندلس: یہ مسجد ۸۵۹ء میں تعمیر ہوئی، صنوبر کی لکڑی سے بنائے گئے اس کے منقش دروازے اس کو دوسری مسجدوں سے ممتاز کرتے ہیں جو مسجد کی تعمیر کے ۱۲۰ برس بعد لگائے گئے تھے۔

جامعۃ القرویین: اس جامعہ کی بنیاد ۸۶۲ء میں رکھی گئی اور چونکہ قیروان کے مہاجرین نے یہاں پہلے اقامت اختیار کی تھی اس لیے یہ قروین کے نام سے منسوب ہے، جامعۃ القرویین کا شمار عالم اسلام کی مشہور ترین جامعات میں ہوتا ہے۔ اس سے علماء، فضلاء، مفکرین، فلاسفہ، ادباء اور شعراء کی ایک کہکشاں برآمد ہوئی جن کی ضیاء پاشی سے علم وادب اور فکر وفلسفہ کی محفلیں روشن ہوئیں اور جنہوں نے مختلف علوم وفنون اور فلسفہ پر نادر اور قیمتی مواد مہیا کیے۔

مدرسۃ الصہریج: یہ مدرسہ چودہویں صدی عیسوی میں بنایا گیا، اس میں وضو کے لیے بہت بڑا حوض اور نمازیوں کے لیے بہت بڑا صحن ہے۔

قصر البطحاء: اس کی تعمیر انیسویں صدی عیسوی میں ہوئی، اس وقت اس کو میوزیم کی شکل دے دی گئی ہے، اس میں صدیوں پرانے مشکیزے اور مغربی قبائلی آرٹ کے بہت سے نمونے رکھے گئے ہیں۔

برج الشمال: اس کو احمد منصور الذہبی نے سولہویں صدی عیسوی میں بنایا تھا اور شہر کی حفاظت کے مقصد سے اس کے جنوبی برج سے متصل دو قلعے بھی بنائے گئے تھے، اس وقت اس کو قدیم اسلحہ جات کا میوزیم بنا دیا گیا ہے۔

مدرسۃ العطارین: اس کو سلطان ابوسعید نے چودہویں صدی عیسوی میں جامعۃ القرویین کے طلبہ کی رہائش کے لیے بنوایا تھا چونکہ یہاں عطاروں کی اکثریت تھی اس لیے اس کا نام مدرسۃ العطارین رکھ دیا گیا۔

زنقۃ العطارین وسوق الحنا: یہ چھوٹی منڈیوں پر مشتمل بازار ہے اور رہ گزر کے دونوں جانب کمہاروں اور خوشبو فروشوں کی قطاریں لگی رہتی ہیں، سیاہ وخاکی رنگ کے سرمے یہاں فروخت ہوتے ہیں اور صدیوں پہلے سے مغربی عورتیں آرائش کے طور پر اس کا استعمال کرتی آرہی ہیں۔

سوق الصباغ: رنگ ریزوں کا بازار ہے، رنگوں کے چھوٹے چھوٹے حوض ہیں، جب اس کا پانی

فرش پر گرتا ہے تو فرش مختلف رنگوں سے رنگ جاتا ہے اور جب اس پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو فرش نہایت خوبصورت اور دلکش منظر پیش کرتا ہے۔

ان کے علاوہ سوق النجارین اور آٹھویں صدی میں ادریس ثانی کی بنوائی ہوئی سرائے اور باب الجلود جس کو ۱۹۱۳ء میں بنایا گیا تھا مشہور تاریخی مقامات ہیں جو واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

جدید شہر فاس: نیو فاس میں داخل ہوتے ہی حسن ثانی سے منسوب کھجور کے درختوں سے محیط وسیع شاہراہ ملے گی جو فرانس اور فلورنسا کے ساحلی میدانوں تک جہاں مغربی بینک ہے لے جائے گی، یا پھر وہیں سے محمد الخامس شاہراہ ملے گی جو اس تجارتی منڈی تک لے جائے گی جہاں بڑے پیمانے پر اشیائے خورد و نوش، لباس، کتابیں اور میگزین و اخبارات وغیرہ کی خرید و فروخت ہوتی ہے، اس منڈی سے سلاوی نامی روڈ نکلتا ہے جو جدید ہوٹلوں و سرکاری اکیڈمیوں اور دفتروں تک جاتا ہے، ان اکیڈمیوں میں ثقافتی و سیاسی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں، یہاں پہنچ کر سیاح جدید شہر فاس کی تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا باب الدکاکین تک پہنچ جاتا ہے اور یہی باب الدکاکین جدید و قدیم شہر فاس کا سنگم ہے، جدید شہر فاس کے اہم علاقوں، عمارتوں اور کلبوں میں بیچ چوک پر واقع مندوبیۃ السیاحہ، ٹورزم کلب، محمد الخامس چوک پر مکتب الارشاد السیاحی[۲] اور مکتب شرکۃ النقل والخطوط المغربیہ[۳] اور حسن ثانی روڈ پر ریلوے لائن اور فاس کا ہوائی اڈہ ہے، جدید فاس میں متعدد اسپورٹس کلب مثلاً مولای سلیمان کے صحن میں فاس اسپورٹ کلب، محمد الکوری روڈ پر گھوڑ سواری مقابلہ کلب اور اسی سے متصل فاس کرکٹ کلب، فٹ بال اور والی بال کلب وغیرہ ہیں۔

مذکورہ بالا تجارتی منڈیاں ہوٹل، کلب، کھیل کے میدان سیاحوں اور خود اس ملک کے باشندوں کے لیے باعث کشش اور بہترین خدمات پیش کرتی ہیں۔ مسلمانوں کے ذریعہ آباد کیا گیا یہ شہر قدامت و جدت کا ایک سنگم اور واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ک، ص اصلاحی

۱؎ ادریس ثانی ادریس بن عبداللہ کا لڑکا تھا جس نے ادریسی حکومت کی بنیاد شمالی افریقہ میں ڈالی اور مغرب کے بربری قبائل نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے انتقال کے بعد جب ادریس ثانی گیارہ برس کا تھا تو قبائل بربر نے جامع ولیلیٰ میں اس کے ہاتھ میں زمام حکومت دی اور اس نے شہر فاس کی بنیاد رکھی۔ ۲؎ ایسی آفس جہاں زائرین کی ہدایت کے لیے کاغذات تیار کیے جاتے ہیں۔ ۳؎ ٹرانسپورٹ آفس اور وہ آفس جہاں ہوائی ٹکٹوں اور ضروری کاغذات تیار کیے جاتے ہیں۔ (مترجم)

ادبیات

غزل

جناب خالد عبادی

اپنے ہی کسی بے سر و سامان کی توہین
اس رنگ کی اس ڈھنگ کی اس شان کی توہین

ہمت نہ ہوئی بیٹھ گئے ریت کی مانند
ہم کرنے چلے تھے بڑے شیطان کی توہین

وہ لوگ جو واقف ہیں ترے جود و کرم سے
ان لوگوں سے ممکن نہیں احسان کی توہین

مے خانے میں آؤ کرو ہر ذکر سے توبہ
یا تم بھی کرو گوڈ کی بھگوان کی توہین

تاوان طلب کرتے ہیں انصاف کے بھوکے
حالاں کہ وہی کرتے ہیں تاوان کی توہین

ہم کوچۂ دلدار کے شائق ہیں ولیکن
اس کوچے میں دیکھی بہت انسان کی توہین

کانوں میں مرے گونجتی رہتی ہے یہ آواز
ہے دوزخی کرتا ہے جو قرآن کی توہین

ہمت ہے تو سلطان کے شانے پہ رکھو ہاتھ
تم کرکے دکھاؤ ہمیں سلطان کی توہین

کس کوچۂ غفلت میں پڑے اونگھ رہے ہو
تم تو نہ کرو عشق کے اعلان کی توہین

معرفت بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ - ۸۰۰۰۰۴۔

مطبوعات جدیدہ

واقعات مشتاقی: تالیف شیخ رزق اللہ مشتاقی، تصحیح وتحشیہ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی وڈاکٹر وقار الحسن صدیقی، بڑی تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۰۰، قیمت: ۵۰۰/روپے، پتہ: رام پور رضا لائبریری، حامد منزل، قلعہ، رامپور، یوپی۔

اکبر بادشاہ کے ابتدائے عہد میں شیخ رزق اللہ مشتاقی دہلوی نے تنہا، سلاطین لودی اور مغل بادشاہوں میں بابر، ہمایوں اور اسی عہد کے شیر شاہ، ابراہیم شاہ، اسلام شاہ، مبارز خان کے علاوہ مانڈو اور گجرات کے بادشاہوں کے حالات کو جمع ومرتب کیا اور اپنے زمانہ کے انداز نگارش کے مطابق بادشاہوں کی جنگوں اور مہمات کے ساتھ صوفیہ اور درویشوں کے حالات بھی مرتب کردیے۔اس اہم تاریخی نوشتے کی دریافت برٹش لائبریری سے ہوئی، تاریخ داؤدی کی طرح واقعات مشتاقی کے مخطوطے کو حاصل کیا گیا، رضا لائبری کے سابق ذمہ دار ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی مرحوم نے مرتب کرکے اور انگریزی میں مقدمہ لکھ کر اس کو شائع کیا، تصحیح وتحشیہ کا کام جناب اقتدار فاروقی کے قلم سے ہوا، یہ تاریخ اس لیے اہم اور دلچسپ ہے کہ اس میں حکایتوں کا لطف ہے اور حقیقتوں کی عکاسی بھی ہے، اکبر کے عہد میں شیر شاہ یا دوسرے سوری بادشاہوں کی تعریف لکھنا آسان نہیں تھا، افغانوں کے عہد میں روپے کی زیادہ قیمت کو انہوں نے جس طرح واضح کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض شطاری سلسلے کے تارک الدنیا صوفی ہی نہیں تھے، عام سماجی حالات پر بھی ان کی نظر تھی، اس طرح اس عہد کی اصل تصویر دیکھنے میں واقعات مشتاقی سے کئی زاویے مہیا ہوتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ حالات کو بیان کرنے میں انہوں نے اپنی یادداشت کا سہارا لیا اور قریب ۷۰-۷۵ سال کی عمر میں ان حالات کی واقعیت میں داستان گوئی کے اوصاف بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں جیسے بابر کے بارے میں لکھا کہ چندیری کے قلعہ کی فتح کے

دوران بابر نے آبِ گنگا کو استعمال نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ ''این را کافراں می پرستند، مارانشاید استعمال کردن'' حالانکہ چندیری کے آس پاس بھی گنگا نہیں گزری، چندیری کا دامن تو بیتوا ندی سے تر ہے۔ فاضل مرتب کی نظر میں مشتاق کے اسلوب میں ادبی کشش نہیں، زبان سادہ اور ناہموار ہے لیکن بعض خامیوں کے باوجود تاریخ مسلمانان ہند سے واقف ہونے کے لیے اس کی افادیت بلکہ اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

افکار عالم، فکر اسلامی کی روشنی میں: از جناب مولانا اسیر ادروی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۴۱۶، قیمت درج نہیں، پتہ: شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند، یوپی۔

دینی، تعلیمی اور علمی حلقوں میں مولانا اسیر ادروی مشہور و متعارف ہیں، بنارس کے مجلّہ ترجمان الاسلام میں ان کی تحریروں نے ان کی صحافتی پختگی کے ساتھ ان کے قلم کی شگفتگی کے جوہر دکھائے، اعتدال و توازن اور فکر و رائے کی اصابت ان کی خاص خوبی ہے، صحافت میں علم و ادب کے بہترین امتزاج میں وہ مولانا عثمان فارقلیط، مولانا سعید اکبرآبادی اور ماہر القادری و عامر عثمانی جیسے مشاہیر کی صف میں بھی نمایاں ہیں، اس کتاب میں مختلف موضوعات پر ان کے کئی مضامین یکجا کیے گئے ہیں، تاریخ تدوین حدیث اور مستشرقین، ایک قدیم ترین مجموعۂ احادیث کا تعارف، مصنف عبدالرزاق میں کتاب الجامع کا قضیہ، تاریخ طبری سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ،فکر فراہی اور امین احسن اصلاحی اور احادیث کا ادبی مقام و مرتبہ جیسے عنوانات کے ساتھ اکبر آبادی، کلیم عاجز، اشعر رام نگری اور مولانا تقی الدین عثمانی کے سفرنامہ جہاں دیدہ پر بھی تحریریں ہیں اور یہ سب بالخصوص تاریخ تدوین حدیث اور سعید بن منصور کی کتاب السنن دلائل و معلومات کے لحاظ سے بہت اہم ہیں، طبری کے متعلق اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے کہ تفسیر کے طبری کوئی اور ہیں اور مورخ طبر کوئی اور، مصنف عبدالرزاق میں معمر بن راشد کی کتاب الجامع کے بارے میں شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر حمید اللہ میں اختلاف رائے کی بحث چھڑی، مولانا ادروی نے اس قضیہ کے متعلق صحیح فیصلہ کیا کہ ''عبدالرزاق کے زمانہ سے ہی یہ کتاب

الجامع مصنف کا جز رہی ہے اس لیے مولانا اعظمی کے موقف کو صحیح تسلیم کیا جانا چاہیے''، فکر فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے تعلق سے بحث بہر حال محل نظر ہے یہ کہنا بے دلیل ہے کہ ''تفسیر قرآن میں احادیث و روایات سے اجتناب و احتراز سرسید ہی کے دربار کا عطیہ ہے...... بہت ممکن ہے فکر فراہی میں احادیث کی استنادی حیثیت مشکوک ہو''، اول تو امکانات سے احکام صادر نہیں کیے جاتے اور جب یہ بھی اعتراف ہو کہ ''یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں'' مولانا اصلاحی کے خیالات کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''مولانا فراہی سے ماخوذ نہیں بلکہ خود مولانا اصلاحی کے ذہن و فکر کی پیداوار ہیں، اس لیے براہ راست فکر فراہی سے بدگمانی قطعاً جائز نہیں''، باقی ادبی مضامین فاضل اہل قلم کی ادبی گلکاریوں سے لطف اٹھانے کا خوش رنگ تحفہ ہیں۔

نقوش و خطوط: از پروفیسر عبدالباری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۶، قیمت: ۱۳۰/روپے، پتہ: فرید بک ڈپو، ۵۹-۲۱۵۸، ایم پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی۔

یہ کتاب بھی مختلف موضوعات پر مضامین کا مجموعہ ہے، قرآنیات، حدیث، سیرت کے علاوہ سرسید، سید سلیمان اشرف، مولانا آزاد پر بھی تحریریں ہیں، عربی زبان وادب کے تحت جریر، احمد شوقی، ابن الطفیل، ڈاکٹر شوقی ضیف کے ادب و شعر کا جائزہ ہے، شیخ سرہندی کے متعلق ایک مخطوطہ کا تعارف اور صبح الاعشیٰ میں ہندوستان کے ذکر کو بھی پیش کیا گیا، ان کے علاوہ بھی متفرقات کے عنوان سے کئی اہم اور مفید تحریریں ہیں، ہندوستان کے انگریزی مفسرین میں مولانا دریابادی کے ترجمہ و تفسیر کو تصنیف سے تعبیر کیا ہے، اس تعبیر کی غرابت، مخفی نہیں، ان کی نگاہ میں ''ہند میں موجود تفسیری سرمایے میں یہ مجموعی حیثیت سے سب سے عمدہ اور وقیع تصنیف (؟) ہے''۔ چند کے سوا باقی تمام مضامین میں اختصار ہے تاہم وہ معلومات افزا ہیں۔

روشنائی کے سفیر: از جناب انور جلال پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۲۴، قیمت: ۲۰۰/روپے، پتہ: اقرا کمپیوٹر سنٹر، ۱۳/سی کاٹجو روڈ، الہ آباد اور لکھنؤ کے مکتبے۔

انور جلال پوری مشاعروں کے ہی نہیں صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے مقبول عام ہیں، اب تک ان کی پانچ شعری کاوشیں نعت و غزل کے پیرایہ میں ڈھل چکی ہیں، زیر نظر کتاب نثر سے پیار کا پہلا اظہار ہے اور پہلے جملے میں اس اعتراف کے ساتھ ہے کہ نثر لکھنا، شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے لیکن یہ نکتہ بھی ان کے لیے پوشیدہ نہیں کہ شعر کی طرح نثر کی بھی اپنی ایک موسیقی ہے اور یہ کہ نثر کو شاعری تو نہیں بننا چاہیے مگر شاعری کی مقناطیسیت سے محروم بھی نہیں ہونا چاہیے، قدرتاً اس معیار پر ان کے پسندیدہ نثر نگاروں میں شبلی، آزاد اور سرور آتے ہیں، تاثیر و تاثر کی سچائی تھی کہ ان کی نثر موسیقی و مقناطیسیت کی خوبیوں سے آراستہ ہوگئی ہے، اقبال شناسی بجائے خود قلب و ذہن کی استواری و سلامتی کی دلیل ہے، اس مجموعہ میں سب سے زیادہ یعنی تین مضامین اقبال کی عبقریت، خود آگاہی اور انسانی عظمت کے تعلق سے ہیں، دو مضامین جناب ملک زادہ منظور پر ہیں جن کے متعلق مضمون نگار کا اعتقاد ہے کہ وہ شرافت، عالی ظرفی، انکسار اور بردباری کا مجموعہ ہیں، عمر قریشی، ثقلین حیدر، خمار، بشیر بدر، راحت اندوری، منور رانا جیسے شعراء ان کے شعری شبستانوں کے ندیم و جلیس ہیں، ان کا ذکر دور کا جلوہ نہیں بلکہ قربتوں کا وہ مشاہدہ ہے جو کسی بھی مرقع آرائی کو سچے رنگوں سے سنوار دیتا ہے، اس کے علاوہ چند مضامین میں اپنے خاندان و وطن کی سرگذشت ہے، اپنے بارے میں لکھنا واقعی سب سے دشوار کام ہے، خود کو باندھنے میں کئی بار کھل جانے کا خطرہ ہمہ وقت پیش نظر رہتا ہے لیکن اس مشکل مرحلے کو انہوں نے آسانی ہی نہیں خوبی سے سر کیا ہے، مشاعروں کا عالم، الگ ہی ہوتا ہے، ظاہری تصویر، شیخ و زاہد کے لیے سخت صبر آزما لیکن انور کو روضۂ انورؐ کے قصیدہ نگار ہونے کی برکت یوں ملی کہ ''جسم کے ساتھ نگاہوں کو بھی باوضو رکھنے کا شرف حاصل ہوا'' وہ شبلی کالج کے طالب علم رہے، ایک لائق و سعید فرزند کی طرح انہوں نے اقرار کیا کہ یہ کالج میرے لیے مثالی تربیت گاہ ثابت ہوا، یہیں دارالمصنفین سے تعلق ہوا، شاہ معین الدین، سید صباح الدین اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی علمی صحبتوں اور ان کے اثر فیض کو وہ نہیں بھولے، دارالمصنفین کی گولڈن جبلی کے موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ جملہ ان کی یادوں کا حصہ بن گیا کہ ''تہذیبیں کبھی نہیں ٹکراتیں ہمیشہ وحشتیں ٹکراتی ہیں'' جلال پور مردم خیز تاریخی قصبہ ہے، ایک مضمون سے وطن کا یہ قرض بھی ادا ہوا کہ اس کا تعارف اس

جملے سے ہوگیا کہ "یہاں کی تاریخ کبھی نشیب و فراز کا شکار نہیں ہوئی" اور یہ کہ "یہ آج بھی قومی یکجہتی کی نشانی ہے" اقبال ان کے غالباً سب سے بڑے ممدوح ہیں، ان کے نزدیک سرسید کی دور اندیشی، حالی کا درد، اکبر کی تڑپ، شبلی کی عقیدت اسلاف اور مولانا نانوتوی کے نور کا مجموعہ، اقبال کی شخصیت ہے، ظاہر ہے یہ ان کا تاثر ہے لیکن انہوں نے شروع ہی میں صاف کردیا کہ یہ سارے مضامین تاثراتی تبصرے ہیں گو تنقید کی جھلک کہیں کہیں نظر آسکتی ہے، روشنائی کے سفیر روشنی کے بھی سفیر ہیں، تجلیوں اور کرنوں کے اس سفر میں مصنف دوسروں کو شامل کرنے میں یقیناً کامیاب ہیں۔

کلیات عادل: مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۱۹۲، قیمت: ۱۰۰/روپے، پتہ: رحیم اسٹورس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور، مہاراشٹر۔

مہاراشٹر اور ودربھ کی سرزمین پر اردو کی بے لوث خدمت کرنے والوں میں اس کتاب کے مرتب کا نام سرفہرست ہے، وہ تصنیف و تالیف کے ذریعہ یہ خدمت جس تسلسل سے انجام دے رہے ہیں، اس کی مثال بہت کم ملتی ہے، ۲۸ کتابیں ان کے نام ہیں لیکن قلم اب بھی تیز گام ہے، زیرنظر شعری مجموعہ انیسویں صدی کے ناگپور میں اردو علم و ادب کے مرتبہ بلند پر فائز سید عبدالعلی عادل کا ہے، مخطوطے کی شکل میں یہ موجود اور غیر مطبوع تھا، امراض و مصائب سے دوچار جناب ساحل نے جس طرح اس کو مرتب کرکے شائع کیا اس کو کارنامہ سے تعبیر کیا جانا چاہیے، عادل کے حالات لکھے، ان کی دوسری کتابوں کا تعارف کرایا، کلیات متقدمین اساتذہ سخن کے کلام کا ہم پلہ ہے، مشکل بحروں میں طویل غزلیں، عادل کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں، خود ان کو بھی اس کا احساس تھا کہ

کھینچتا ہے شکل معنی کلک عادل نو بہ نو　　رنگ گونا گوں بھرے ہیں خامۂ بہزاد میں

ع-ص